

ایک رات کی شادی

بارہواں مجموعہ

جرم اور سرِ اغرسی کی پانچ سچی کہانیاں

احمد یار خان



فہرست

ایک رات کی شادی

دولت، تکبر اور تنہا

گول کا تارا

جہاں راتیں جاگتی اور دن سوتے ہیں

پیلار و مال، لال ست سہری اکال

پیش لفظ

محترم احمد یار خان کی تفتیشی کہانیوں کا یہ بار ہواں مجموعہ ہے۔ ہر مجموعے کے ساتھ پیش لفظ لکھا جاتا ہے جس کی چنداں ضرورت تو نہیں ہوتی لیکن ان قارئین کے لیے جن کے ہاتھوں میں محترم احمد یار خان کی کوئی سی کتاب پہلی بار آتی ہے اور وہ اس مصنف کی تحریروں سے متعارف نہیں ہوتے، پیش لفظ ضروری سمجھا جاتا ہے۔

قارئین نے یہ تو تسلیم کر لیا ہے کہ محترم احمد یار خان کی کہانیاں حقیقی ہوتی ہیں لیکن کئی ایک قارئین یہ تسلیم نہیں کرتے کہ کوئی تھانیدار اتنی دہائی اور اتنی محنت سے تفتیش اور سرانظر سانی کرتا ہوگا۔ یہ وہ قارئین ہیں جنہوں نے اپنے پیارے پاکستان کی پولیس دیکھی ہے اور انگریزوں کا دور حکومت نہیں دیکھا۔ انگریز اپنی توہین برداشت کر لیتا تھا، اپنے قانون کی بے حرمتی برداشت نہیں کرتا تھا۔ ہر علاقے کا ڈی ایس پی ہر واردات کی تفتیش پر ذاتی نظر رکھتا اور تاخیر کی جواب طلبی کرتا تھا۔ تھانیداروں کی ترقی کا دار و مدار خوشامد پر نہیں بلکہ وارداتوں کی کامیاب تفتیشوں پر ہوتا تھا۔

اور پروالوں کی اتنی سختی ہر تھانیدار کو مجبور کیے کھتی تھی کہ وہ کھانا پینا اور سونا بھول جائے اور جو واردات ہو گئی ہے اس کے لزموں کو کھڑے۔ ان حالات میں بیشتر تھانیدار احمد یار خان جیسے ہوتے تھے۔ ہمارے احمد یار خان ذرا زیادہ ہی دیانت دار تھے لیکن وہ اپنے آپ کو دوسروں سے اعلیٰ اور بالا نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ہر تھانیدار کا فرض ہے کہ قانون کا احترام کرے اور دوسروں سے احترام کرے اور جو زمانے اُسے سزا دلائے۔ پاکستان کا قانون تو ہمارے لیے زیادہ مقدس ہے۔ یہ ہمارا اپنا قانون ہے۔

اپنے قانون کی جس طرح مٹی پلید ہو رہی ہے وہ ہم سب دیکھ رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قانون کا تحفظ کرنے والوں کے دلوں میں ہی قانون کا احترام نہیں رہا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ پولیس کا استعمال بدل گیا ہے اور اس کے ساتھ مجرم بھی استعمال کی چیز بن گئے ہیں۔ امتداد کے تحفظ کے لیے پولیس اور سیاست میں جرائم پیشہ لوگوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ قانون کی دھجیاں اڑ رہی ہیں۔

ان کمائیوں میں آپ کو ایسی دلچسپیاں ملیں گی کہ آپ ہر کمائی ایک ہی نشست میں پڑھنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ ہر کمائی میں آپ کو اپنے معاشرے کے رنگ ملیں گے اور معاشرے کی خوبیاں اور قباحتیں بھی۔ ایسے مقام بھی آئیں گے جہاں آپ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکیں گے۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ ”حکایت“ لاہور

ایک رات کی شادی

مجم کا ارتکاب صرف جرائم پیشہ لوگ ہی نہیں کیا کرتے، مومن بھی بوقت ضرورت مجرم بن جایا کرتے ہیں۔ یہ صرف تھانیدار جانتے ہیں کہ انسانی فطرت بڑی مگڑا اور عجیب ہے، اپنے اُوپر شرافت اور عبادت کا پردہ بھی ڈال لیا کرتی ہے۔ میں آپ کو ایسے ہی انسانوں کی کمائی سناؤں گا جن کے متعلق کوئی بھی یقین نہیں کیا کرتا کہ وہ کوئی انتہائی معمولی اور بے ضرر سا مجرم بھی کر سکتے ہیں۔ یہ کیس میرے تھانے کا نہیں تھا اور میں اُس وقت تھانیدار بھی نہیں رہا تھا۔

میں نشن سے پہلے کی ٹھٹھی پر گھر آ گیا تھا۔ میرا ایک تھانیدار دوست میرے گاؤں سے پچاس میل دور ایک تھانے کا ایس۔ ایچ۔ او تھا۔ بڑا پیارا دوست تھا۔ اُس نے مجھے اپنے ہاں مدعو کیا کہ دو چار دن اُس کے پاس رہوں۔ میں اب فافخ تھا۔ اُس کے ہاں چلا گیا۔ پانچ سات دن ٹھہرنے کا ارادہ تھا۔ دو ہی دن گزرے تھے کہ صبح سویرے اطلاع آئی کہ قصبے سے کوئی نصف میل دور ایک لاش پڑی ہے، اور یہ قتل کی واردات ہے۔ اطلاع لانے والا ایک نمبر دار تھا۔ اُس کے ساتھ دو آدمی اور تھے۔

مہزدار نے بتایا کہ لاش کے گلے میں رسی کس کر بندھی ہوئی ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُسے اس رسی کے پھندے سے مارا گیا ہے۔ لاش کی حالت یہ بتائی گئی کہ دونوں ٹانگوں کا کچھ گوشت بچا اور گیدڑ کھا گئے ہیں۔ پیٹ بھی انہی کا پھاڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مقتول قصبے کی ایک... چھوٹی سی مسجد کا امام تھا اور گناہ سارا آدمی تھا۔

میں اب جتنے بھی نام لکھوں گا، وہ فرضی ہوں گے۔ واردات کے مقام کا نام ظاہر نہیں کروں گا۔ اس پردہ داری کی وجہ یہ ہے کہ یہ مقام پاکستان میں ہے اور واردات سے متعلق افراد میں سے بعض شاید زندہ ہوں گے۔

یہ میرے میزبان اور دوست سب انسپٹر یعقوب علی کے تھانے کا کیس تھا۔ وہ کوئی انارڈی اور کام چور سب انسپٹر نہیں تھا۔ میں چونکہ اُس کا مہمان تھا اس لیے اُس نے مجھے کہا کہ میں تعیش میں اُس کا ساتھ دوں۔ وہ مجھے اپنا استاد سمجھتا تھا۔ مجھے اطمینان سا ہوا کہ ایک مصروفیت مل گئی ہے۔ فراغت مجھے پریشان کر رہی تھی۔

میں یعقوب علی کے ساتھ موقع واردات پر چلا گیا۔ لاش بیٹھے کے بل پڑی تھی۔ گلے میں رسی تھی جسے ایک ہی کانٹھ دی گئی تھی۔ مقتول چونکہ مرچا تھا اس لیے کانٹھ ڈھیل نہیں ہوئی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ شخص رات کو قتل ہوا ہے۔ پیٹ پھٹا ہوا اور ٹانگوں کا خاصا حصہ گیدڑوں وغیرہ کا کھایا ہوا تھا۔ لاش کی جامہ تلاشی لی۔ مقتول نے کھدک کر تہ پہن رکھا تھا۔ اُس کی جیسے تین سوکھین روپے اور چند آنے، ایک جاقو جس کا پھل چھرا پانچ تھا، ایک نکاح نامہ اور دو چایا

برآمد ہوئیں۔

ان اشیاء کے متعلق کچھ باتیں ضروری ہیں جو آپ ذہن میں رکھیں۔ اُس وقت تین سوکھین روپے خاصی زیادہ رقم سمجھی جاتی تھی۔ اتنا بڑا چاقو جو کافی دار تھا، کوئی عام آدمی جیب میں نہیں رکھتا تھا۔ یہ تو چھوٹی سی ایک مسجد کا غریب سا امام تھا۔ اہم چیز نکاح نامہ تھا۔ اس پر چار روز پہلے کی تاریخ تھی۔ اس کے مطابق کسی عبدالمجید کا نکاح کسی رحمت بی بی کے ساتھ پڑھا گیا تھا۔ عورت مطلقہ لکھی ہوئی تھی یعنی اسے طلاق ہوئی تھی اور اب اُس کا نکاح عبدالمجید کے ساتھ پڑھا گیا تھا۔

ہمیں بتایا گیا کہ مقتول کا اپنا نام عبدالمجید ہے۔ ولدیت بھی لکھی ہوئی تھی لیکن اُسے جاننے والوں کو اُس کی ولدیت معلوم نہیں تھی اس لیے تصدیق نہ ہو سکی کہ یہ نکاح نامہ مقتول کا اپنا ہے۔ یہ اُس کا اپنا ہی تھا کیونکہ نکاح کی جیب میں تھا۔ اتنے میں کھوجی آگیا۔ یعقوب علی نے تھانے سے چلتے وقت اُسے بلانے کے لیے آدمی بھیج دیا تھا۔ لاش کے ارد گرد گیدڑوں وغیرہ نے اور لاش دیکھنے والوں نے کھرے مٹا دیے تھے۔ کھوجی اپنے فن کا ماہر تھا۔ اُس نے مقتول کی جوتی دیکھی۔ یگر گائی تھی جسے آج کل مکیشین کہتے ہیں۔ اس کے ایک پاؤں کے نیچے کا تلوار میدان سے پھٹا ہوا تھا اور دونوں ایڑیاں اس طرح مرمت کی گئی تھیں کہ آدھی آدھی ایڑیوں پر چڑھالگا یا گیا تھا۔ مختصر یہ کہ تودوں کی حالت ایسی تھی کہ ان کا کھرا (زمین پر ان کے نشان) عام کھروں سے الگ تھلگ تھا جو آسانی سے دیکھا جاسکتا تھا۔

کھوجی کے ساتھ اپنا ایک مددگار بھی تھا یعقوب علی نے اپنا ایک فٹیل

اُس کے ساتھ چھوڑا۔ چارپائی منگوائی اور ضروری کاغذی کارروائی کر کے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے ہسپتال بھجوا دی۔ وہاں سول (سرکاری) ہسپتال تھا جہاں پوسٹ مارٹم کا انتظام تھا۔ خون، پیٹ کے اعضا اور مواد وغیرہ کا ٹسٹ لاہور ہوتا تھا۔ اس لاش کا صرف پوسٹ مارٹم درکار تھا۔

نکاح کس کا پڑھا گیا؟

مقتول مسجد سے چند گھر دور کرانے کے مکان میں رہتا تھا۔ وہاں محلے والوں سے اُس کے متعلق پوچھا۔ اُس کے مکان کے باہر تالا لگا ہوا تھا۔ اُن دو چابیوں میں سے جو لاش سے برآمد ہوئی تھیں، ایک تالے کو لگ گئی تالہ کھول کر ہم اندر گئے۔ کچے فرش کا صحن تھا۔ ایک بڑا کمرہ اور اس کے دائیں اور بائیں دو کونٹریاں تھیں۔ مکان کا کچھ حصہ مینیٹوں کا اور کچھ پتھروں کا بنا ہوا تھا۔ کمرے کے دروازے کو بھی تالا لگا ہوا تھا۔ دوسری چابی اس تالے کو لگ گئی۔

کمرے میں کوئی زیادہ سامان نہیں تھا۔ ایک بڑا ناٹرنک تھا۔ مقتول نہیں تھا۔ کھول کر دیکھا۔ کچھ کپڑے تھے اور کچھ اور چیزیں جو نصیبت میں کوئی مدد نہیں دے سکتی تھیں۔ دو چار پائیاں تھیں۔ ان میں ایک اچھی قسم کی چوڑی چارپائی تھی۔ اس پر سفید چادر کچی تھی۔ لمحات تھا جو شہ کی ہوا نہیں تھا۔ ویسے ہی پانسی پڑا تھا۔ ہمیں جس چیز نے متوجہ کیا وہ ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے تھے۔ کچھ بستر پر پڑے تھے اور کچھ چارپائی کے ساتھ فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔

جس واردات کا شکار کوئی عورت ہوئی ہو، یا عورت کسی نہ کسی وجہ سے موقعہ واردات پر موجود ہو تو ایک آدھ چوڑی ٹوٹ جاتی ہے اور ایک دو ٹکڑے پڑے ملتے ہیں مگر یہاں معلوم ہوتا تھا کہ بہت سی چوڑیاں ٹوٹی ہیں۔ سوال پیدا ہوا۔ کیا کسی عورت کے ساتھ زبردستی کی گئی یا تشدد کیا گیا ہے؟ یعقوب علی نے مزید غور سے دیکھا تو بستر کی سفید چادر پر تین چار لمبے بال بھی پڑے مل گئے جو عورت کے ہی ہو سکتے تھے۔

میرا دھیان نکاح نانے کی طرف گیا۔ تین روز پہلے کا یہ نکاح نامہ مقتول کا ہی ہو سکتا تھا اور چوڑیاں اُس کی بیوی کی تھیں۔ مطلقاً اب یہ ہو گئی تھی۔ میں نے اور یعقوب علی نے محلے کے دو بہن معززین اور دو تین ایسے آدمیوں سے جو ہر گھر کی خبر رکھتے ہیں، مقتول کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ مقتول کی عمر پچیس چھتیس سال تھی۔ یہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کہاں کا رہنے والا ہے۔ نو دس مہینے گزرے، یہاں کسی مسجد کی تلاش میں امامت کے لیے آیا تھا۔ اتفاق سے اس مسجد کا امام فوت ہو چکا تھا۔ محلے والوں نے مسجد مقتول کو دے دی۔ اس کا نام عبدالمجید تھا۔ وہ چلا گیا اور اگلی شام ایک ٹرنک اور ایک بستر لے کے آ گیا۔ اُس کے ساتھ بیوی بچے نہیں تھے۔ کہتا تھا کہ بیوی مر گئی ہے اور بچہ کوئی نہیں سب نے کہا کہ مقتول خاموش طبع اور نیک انسان تھا۔ میں نے ان لوگوں سے کہا کہ کسی آدمی کو اس لیے نیک کہنا کہ وہ ناز و زور سے کی پابندی کرتا ہے اور امام ہے، میرے لیے قابل قبول نہیں۔ مجھے مذہب سے ہٹ کر بتاؤ کہ لوگ اسے کیوں نیک سمجھتے تھے۔ محلے کے معزز افراد نے مجھے پر ثابت کر دیا کہ وہ واقعی نیک

شریف اور چپ چاپ زندگی بسر کرنے والا انسان تھا۔ ان سب نے حیرت کا اظہار کیا کہ اس بے ضرر انسان کو کس نے قتل کیا ہے اور قتل کی وجہ کیا ہو سکتی ہے۔ مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ مقتول شریف اور بے ضرر انسان تھا۔

یہ بھی بتایا گیا کہ تین دنوں... وہ کسی کو بتائے بغیر کیس جلا گیا تھا یعقوب علی نے ان لوگوں سے پوچھا کہ مقتول نے کسی رحمت بی بی کے ساتھ شادی کی ہے، کیا وہ اس نکاح سے واقف ہیں؟۔ نہیں کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اُس نے تین روز پہلے کسی مطلقہ کے ساتھ نکاح پڑھوایا ہے۔ اسے بہت قریب سے جاننے والوں سے بھی پوچھا۔ انہوں نے بھی کہا کہ مقتول نے نکاح نامے والی تاریخ کسی سے نکاح نہیں پڑھوایا۔ اگر کہیں اور جا کے پڑھ لیا ہو تو وہ نہیں جانتے۔

مقتول کا کھانا لوگوں کے گھر دے آتا تھا محلے والوں کی مدد سے ہمیں دو بچے مل گئے جو اُس شام مقتول کے گھر کھانا دینے گئے تھے۔ وہ گیارہ بارہ سال عمر کے تھے۔ دونوں مختلف گھروں کے تھے۔ دونوں مغرب کی نماز کے بعد کھانا دینے گئے تھے۔ بچوں سے ہم نے کوئی ناشرع کیا۔ انہوں نے بتایا کہ مقتول گھر میں ہر روز کی طرح ایسا تھا۔ ہر روز کی طرح بچوں سے کھانا لے کر اُس نے دونوں کے سردوں پر ہاتھ پھیرا اور مسکرایا۔ اُس کے گھر میں کوئی عورت نہیں تھی۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ یہ عبدالمجید کوئی اور ہے جس کا نکاح رحمت بی بی

پڑھا گیا ہے، مگر نکاح نامہ اس کے پاس کیوں تھا؟۔ اس سوال کا جواب ایک اور شخص دے سکتا تھا۔ وہ تھا بڑی مسجد کا خطیب۔ نکاح رجسٹر اُس کے پاس رہتا تھا۔ اُس وقت نکاح کے فارم الگ نہیں ہوتے تھے۔ رجسٹر ہوتا تھا۔

اس میں چھپے ہوئے فارم ہوتے تھے۔ ایک لڑکے کو، دوسرا لڑکی کو دے دیا جاتا اور ایک (کاؤنٹر فائل) رجسٹر میں لگا رہتا تھا۔ رجسٹر نکاح خوان کے پاس رہتا تھا۔ کوئی اور مولوی نکاح پڑھائے تو رجسٹر نکاح خوان سے حاصل کر لیتا تھا۔

خطیب کو ہم نے نکاح رجسٹر کے ساتھ مقتول کے گھر لایا۔ اس میں کاؤنٹر فائل لگا ہوا تھا۔ ہمارے پوچھنے پر خطیب نے بتایا کہ مقتول نکاح کی تاریخ کو عصر کی نماز کے بعد گیا تھا اور یہ کہہ کر اُس سے رجسٹر لایا تھا کہ ایک غریب آدمی اور غریب بیوہ کا نکاح پڑھنا ہے۔ عشاء کی نماز سے کچھ دیر پہلے اُس نے رجسٹر واپس کر دیا تھا۔ ”آپ نے رجسٹر کھول کر دیکھا تھا کہ نکاح کس کا پڑھا گیا ہے اور کیا اندراج صحیح کیے گئے ہیں؟“

”یہ تو مجھے دیکھنا ہی ہوتا ہے“ خطیب نے جواب دیا۔ ”میں نے نام پڑھا تو یہ عبدالمجید تھا۔ مقتول کا نام بھی عبدالمجید تھا۔ میں نے اُس سے سنس کر چھپا کر اُس نے اپنا نکاح پڑھا ہے؟... اُس نے جواب دیا تھا کہ میرا نکاح جب کبھی ہو گا وہ آپ پڑھیں گے اور اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ ایک مجھ صلیب غریب اور میرا ہم نام ہے۔“

مقتول کی حبیب سے جو نکاح نامہ نکلا، اسے ہم نے کاؤنٹر فائل سے ملایا۔ ایک ہی تحریر تھی۔ اس پر عبدالمجید کے دستخط تھے۔ رحمت بی بی کا لکھا لگا ہوا تھا۔ دو گواہوں کے بھی دستخط تھے۔ دستخطوں سے پتہ چلتا تھا کہ دونوں بہت تھوڑے پڑھے لکھے ہیں۔ ہماری مدد پر دو گواہ کر سکتے تھے۔

عورت رہزنوں کے کام کی تھی

ایک کانسیٹیل جو باہر کھڑا تھا، ایک آدمی کو اندر لایا۔ اُس نے بتایا کہ عشاء کی نماز کے بعد مقتول کو اُس نے کہیں سے اپنے گھر کو آتے دیکھا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک عورت تھی جس نے سفید برقعہ (اُس دور کا شل کاک کی طرح) اڈھ رکھا تھا۔ اُس کا منہ برقعے میں تھا۔ مقتول نے نالہ کھولا اور عورت کے ساتھ وہ اندر چلا گیا تھا۔

یہ سن کر میں نے دریافت کیا کہ مقتول نے عشاء کی نماز پڑھائی تھی یا نہیں۔ اُس نے نماز پڑھائی تھی۔ اُس کا مکان مسجد سے تھوڑی ہی دور تھا۔ یہ کوئی نہ بتا سکا کہ وہ اپنے گھر گیا تھا یا کہیں اور چلا گیا تھا۔ یعقوب علی کے ایک سوال کے جواب میں مجھے کے معززین نے بتایا کہ مقتول کے گھر میں کبھی کوئی عورت نہیں آئی تھی۔ انہی سے پتہ چلا کہ عشاء کی نماز آخری نماز تھی جو اُس نے پڑھائی۔ اگلی صبح اُس نے اذان بھی نہ دی۔ اُس کے گھر جا کے دیکھا، باہر تالہ لگا ہوا تھا۔ ہمارے سامنے جو سوال اور شکوک آئے وہ یہ تھے:

مقتول نے عشاء سے پہلے نکاح رجسٹر خطیب کو داپس کیا تھا اور وہ عشاء کی نماز کے بعد ایک عورت کو ساتھ لایا۔ کیا نکاح اُس نے اپنا پڑھایا تھا؟ کیا وہ عورت جو اُس کے ساتھ آئی تھی وہ اُس کی بیوی تھی؟ کیا کوئی آدمی اپنا نکاح خود پڑھا سکتا ہے؟ نہیں۔ یہاں سے یہ شک پیدا ہوا کہ وہ کسی اور عورت

کو ساتھ لایا تھا جو اُس کی بیوی نہیں تھی۔ اس عورت کے لواحقین آگئے۔ عورت اُن کے ساتھ جانا نہیں چاہتی ہوگی۔ انہوں نے اُسے مارا پیٹا اور گھسیٹا ہوگا۔ اسی لیے اتنی زیادہ چوڑیاں ٹوٹیں۔ یہی لوگ مقتول کو بھی اٹھا کر یکسی طرح اپنے ساتھ لے گئے اور قصبے سے باہر جا کر اُس کے گلے میں رشتی ڈالی اور قتل کر دیا۔ وہ عورت کو اپنے ساتھ لے گئے۔

ایک شک یہ بھی تھا کہ مقتول اس عورت کے ساتھ نکاح پڑھا کر اُسے اپنے ساتھ گاؤں سے لے جا رہا تھا۔ اس عورت کے کسی اور امیدوار نے رستے میں مقتول کو ختم کیا اور عورت کو اٹھا لے گیا۔ یہ واردات رہزنی کی نہیں تھی، ورنہ مقتول کی جیب میں تین سو پچپن روپے نہ ہوتے اور رہزن اتنا بڑا چاقو بھی لے جاتے۔

یہ بھی ہو سکتا تھا کہ عورت نے بہت سے زیورات پہن رکھے ہوں۔ زیورات کے علاوہ وہ خود بھی قیمتی ہوگی۔ نکاح نامے میں اُس کی عمر تیس سال لکھی ہوئی تھی۔ یہ جوانی کی عمر ہوتی ہے۔ رہزن زیورات کے ساتھ عورت کو بھی لے گئے اور انہوں نے مقتول کو ختم کرنا بہتر سمجھا ہوگا۔

رحمت بی بی کون تھی؟ کیا وہ کہیں باہر سے آئی تھی یا اسی قصبے کی رہنے والی تھی؟ اور ایک سوال یہ بھی سامنے آیا کہ نکاح اگر مقتول کا ہی پڑھا گیا تھا تو اُس نے مجھے والوں سے کیوں چھپایا؟

میں نے اول یعقوب علی نے مقتول کے گھر ہی ذرا ایک طرف ہو کر ان سوالوں اور شکوک پر غور کیا اور طے کیا کہ کون سی لائن اختیار کی جائے۔ دن کے دو بج رہے تھے۔ وہاں سے اٹھنے کا ابھی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ہم قتل کی کم از کم

تحریک یعنی باعث معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ قتل انتقامی کارروائی بھی معلوم ہوتا تھا اور یہ رہزنیوں کی کارروائی بھی لگتی تھی۔ زیورات اور عورت ہرزوں کے کام کی چیزیں تھیں۔

رحمت بی بی کون تھیں؟

کھوجی آگیا۔ اُس نے بہت محنت کی تھی۔ وہ صبح سے کھڑا اٹھارہ گھنٹا دن کے درج چکے تھے۔ وہ اپنے ایک ساتھی اور کانسیبل کو وہیں چھوڑ آیا تھا تاکہ اُس کے تلاش کیے ہوئے کھوڑوں سے کوئی نہ گزرے۔ یہ خیال بھی رکھیں کہ وہ علاقہ میدانی نہیں، کھڈ، نالوں، ٹیلوں، گھاٹیوں اور سٹوں والی چٹانوں کا علاقہ ہے۔ وہاں کھڑا اٹھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ چلتے چلتے راستوں نیچے چلا جاتا ہے جیسے زمین کو کاٹ کر ایک دیوار ادھر اور ایک ادھر کر دی گئی ہو۔ آگے کسی برساتی ندی کا ریتلا پاٹ ہو گا۔ اس میں کہیں کہیں پانی بھی ہوتا ہے اور پانی نہ ہو تو ریت گیلی ہوگی۔ بعض جگہ ریت اتنی گیلی ہوتی ہے کہ اس پر سے گزردن پائل کے نیچے دب کر بھر اُپر آجاتی ہے اور کھڑا ہوتا ہے۔

پچی مٹی پر چلتے چلتے ایسی زمین آجاتی ہے جس پر باریک باریک اور نوکلی لنگریاں بکھری ہوئی ہوتی ہیں۔ ان پر کھڑا جتنا نہیں کھوجی کھڑا اٹھاتے ہیں یعنی پاؤں کے نشان دیکھتے دیکھتے آگے بڑھتے جاتے ہیں تو کھڑا غائب ہو جاتا ہے۔ میدانی علاقوں کے کھوجی اس علاقے میں اکثر ناکام ہو جاتے ہیں۔ کھوجی ہمیں اپنی رپورٹ دینے لگا تو سب السیکٹر یعقوب علی نے

اُسے روک کر ایک اور کارروائی کی۔ اُس نے اُس جگہ کے بزرگوارہ ذیلدار اور محلے کے معزز افراد کو بلایا۔ قصبوں کے ”معزز“ حضرات میں ایک نسل ”انعام خور“ کہلایا کرتی تھی۔ ہر قصبہ اور شہر میں دو چار انعام خور ہوا کرتے تھے۔ انہیں سرکار انگریزی کی طرف سے الائنس ملا کرتا تھا۔ ان کا کام مخبری تھا۔ انگریزوں نے اپنی حکومت کو بغاوت سے محفوظ رکھنے کے لیے چیدہ چیدہ افراد کو نمبر داری، ذیلدار، سفید پوشی اور انعام خوری عطا کر رکھی تھی بعض کو ویسے ہی درباری بنا رکھا تھا۔ یہ لوگ پولیس کی بہت مدد کیا کرتے تھے مگر کسی جرم کو بچانا چاہتے تو پولیس کو گمراہ بھی کر دیا کرتے تھے۔ منہ مانگی رشوت لے کر بھی پولیس کو گمراہ کیا کرتے تھے۔ انگریزی حکومت پوریا بستر لپیٹ گئی تھی۔ انعام خوروں اور سفید پوشوں کی وہ حیثیت ختم ہو گئی تھی لیکن انہوں نے تھانیداروں کی خوشامد اور اپنے پرانے کے خلاف مخبری جاری رکھی ہوئی تھی۔ یہ ان کی فطرت بن چکی تھی۔ تھانیدار انہیں ہوا دے کر ان سے خوب کام لیتے تھے۔ ان کے علاوہ پولیس کے ہاتھ میں چھوٹے موٹے جرائم کرنے والے چرسی اور جواری تھے جو کامیاب مخبر تھے۔ ان کی بیریاں اور مائیں ان سے زیادہ کامیاب مخبری کرتی تھیں۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

میں یعقوب علی کی کارروائی کا ذکر کر رہا تھا۔ اُس نے ان لوگوں کے ذمے یہ کام لگایا کہ معلوم کریں کہ تین روز پیسے جس رحمت بی بی مطلقہ کا نکاح عبدالمجید کے ساتھ پڑھا گیا ہے وہ کون ہے، کہاں رہتی ہے اور اب کہاں ہے۔ قصبہ جو آج کل باہر کے پیسے سے شہر بن گیا ہے اُس وقت چھوٹا سا نگر

ایک اور مشکل پیدا ہو گئی تھی۔ پہلے وہاں ہندو اور سکھ بھی رہتے تھے۔ مسلمانوں کے محلے الگ تھے۔ آبادی بھی محفوظ تھی۔ اب ہندو سکھ ہندوستان چلے گئے تھے اور ان کے مکانوں میں نہ رہ رہے پارکے مہاجرین آ گئے تھے۔ ایک خیال یہ بھی تھا کہ رحمت بی بی کوئی مہاجر ہو گی۔ اگر ایسا تھا اور مقتول کے قتل کے ساتھ اس کا تعلق تھا تو اس کی تلاش میں مشکل پیدا ہونے کا ڈر تھا۔ بہر حال یعقوب علی نے اپنے اے۔ ایس۔ آئی اور ہیڈ کانٹینبل سے کہہ کر رحمت بی بی کا سراغ لگانے کا انتظام کیا اور وہ افراد جن کا میں نے ادھر ذکر کیا ہے 'قصبے میں پھیل گئے رحمت بی بی کی ولایت بھی نکاح نانے میں لکھی ہوئی تھی۔

عورت کے ساتھ دو آدمی

کھوجی نے رپورٹ دی۔ اُس نے بتایا کہ وہ اس خیال سے کھرے ڈھونڈتا رہا کہ مقتول قصبے سے کہیں جا رہا ہو گا اور راستے میں مارا گیا ہو گا کھرے کچھ اور بتا رہے تھے۔ مقتول جان نہیں رہا تھا، آ رہا تھا اور اُس کے ساتھ ایک عورت تھی۔ جہاں مقتول قتل ہوا وہاں سے عورت کا کھرا قصبے کی طرف آ رہا تھا۔ ان کے ساتھ دو آدمی تھے۔ عورت کا کھرا اُس کی سینڈل کا تھا۔ اُن دونوں ہاتھ کے ایک خاص قسم کے زناہ سینڈل بہت مشہور ہوتے تھے۔ اُن کی اڑی لکڑی کی ہوتی تھی۔ پاؤں چوکھچھوٹا تھا اس لیے کھوجی نے اسے زناہ پاؤں قرار دیا۔ سینڈل کے نشان سے تصدیق ہو گئی کہ یہ عورت تھی۔

کھوجی اور اُس کے ساتھی نے بڑی ہی محنت کی تھی۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مقتول کے پاؤں میں جو جوتی تھی اُس کا ایک ٹکڑا پنچے کے قریب سے ایسے طریقے سے مرتب کیا ہوا تھا اور دونوں اڑیوں کے نیچے چڑھ اس طرح لگا ہوا تھا کہ ذکر کھروں میں یہ کھرا صاف پچانا جاتا تھا۔ اس سراغ پکھوجی نے مقتول کا کھرا ڈھونڈ لیا تھا۔ وہ دیہات کی طرف سے قصبے کی طرف آ رہا تھا جہاں اُس کا کھرا تھا اُس کے ساتھ عورت کا کھرا بھی تھا۔ ان کے ساتھ دو آدمی تھے۔

یہ کھرے کچھ دُور تک نظر آئے تھے پھر غائب ہو گئے کیونکہ علاقہ ایسا تھا کہ آگے کھرے نہیں مل رہے تھے۔ مقتول کا کھرا جائے واردات تک ان کے ساتھ آیا۔ کھوجی کو عورت کا کھرا قصبے کی طرف آتا نظر آ گیا جو آبادی کے قریب آ کر غائب ہو گیا۔ آگے پکی گلیاں تھیں اور صبح لوگوں کی آمد و رفت نے کھرے مٹا ڈالے تھے۔ جب عورت کا ذکر آیا تو مجھے ایک اور خیال آ گیا۔ میں نے کھوجی سے کہا کہ وہ صحن میں ذرا گھوم پھر کر دیکھے۔ صحن کچا تھا اور کشادہ کھوجی نے صحن سے بھید لینا شروع کیا تو بیت الخلاء کے سامنے جہاں فرش زیادہ کچا اور ناک بھی تھا اُسے کھرا نظر آ گیا۔ اُس نے نعرہ لگانے کے انداز سے کہا۔ "یہ ہے۔ وہی ہے۔" میں نے اور یعقوب علی نے بھی وہ کھرا دیکھا۔ یعقوب علی اپنے کام میں دلچسپی لینے والا تھا نیند اُٹھا۔ اُس نے مقتول کا مکان مقلقل کیا اور مجھے کہنے لگا کہ کھوجی نے ساتھ چلتے ہیں۔ اُسے کھرا شناسی کی سوجھ بوجھ مجھ سے زیادہ تھی، بلکہ وہ خود بھی کھوجیوں کی طرح کھرا اٹھا سکتا تھا۔ اُس کے کہنے پکھوجی اُسے قصبے کے اُس طرف لے گیا جہاں عورت کا کھرا نظر آیا تھا۔

یہ ہم تھانے چلے گئے۔

ٹوٹی ہوئی چوڑیاں عورت کا کھڑا۔ ایک نعمت

رات کو ہم کھانا کھا کر اطمینان سے اسی واردات کی باتیں کر رہے تھے اُس وقت تک ہمیں جو سراخ ملے تھے، وہ یہ تھے۔ ٹوٹی ہوئی چوڑیاں ہیں۔ ایک عورت کا کھڑا۔ یہ پتہ چلا کہ مقتول کے ساتھ ایک عورت تھی اور کسی رحمت بی بی کا نکاح کسی عبدالمجید کے ساتھ پڑھا گیا تھا جس کے متعلق یقین کی حد تک شک تھا کہ عبدالمجید مقتول نے اپنا نکاح خود پڑھا تھا۔ مگر اس سے ہماری کوئی مدد نہ ہوئی۔ نعمت ابھی نعمت ہی تھا۔ ہمیں قاتل کی بوجھ نہیں ملی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ایک آدمی آیا۔ وہ اثر در سوخ والا اور چلتا پڑھ "معزز" آدمی تھا۔ اُس نے بتایا کہ نکاح کی تصدیق کیسے سے بھی نہیں ہو سکی۔ البتہ ایک رحمت بی بی کا سراخ ملا ہے جس کی ولدیت یہی ہے لیکن اُس کا اس واردات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ اس شخص نے اپنی بیوی سے اس رحمت بی بی کی عمر معلوم کرائی تھی۔ بیوی نے تیس سال کے لگ بھگ بتائی تھی۔ نکاح نامے میں بھی تیس سال لکھی ہوئی تھی۔ "نہ جی" یعقوب علی نے کہا۔ "وہ بڑا معزز اور شریف گھرانہ ہے۔"

اس گھر کی کسی عورت کا مقتول جیسے آدمی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ اُس نے اس معزز آدمی کو باہر بیٹھنے کو کہا اور مجھے کہنے لگا۔ "دیکھو ملک بھائی! یہ لوگ کتنے کہتے ہیں۔ شریف آدمیوں کو ذلیل کرانے سے بھی باز نہیں آتے۔"

جہاں کھرا ختم ہوتا تھا، وہاں کھڑے ہو کر دیکھا۔ کھڑے کا رخ ایک گلی کی طرف تھا جہاں مقامی لوگ رہتے تھے۔ یہ فیض قیاس تھا کہ عورت دو آدمیوں کے ساتھ اس گلی میں داخل ہوئی ہوگی۔ ہم موقع واردات پر گئے اور وہاں سے کھوجی کی راہنمائی میں کھڑے دیکھے اور وہاں تک چلے گئے جہاں تک کھڑے نظر آتے تھے۔ یہاں میں آپ کو یہ بتا دوں کہ کھڑے اتنی آسانی سے نہیں ملے تھے جتنی آسانی سے میں بیان کر رہا ہوں اور آپ سن رہے ہیں۔ بعض جگہ کھڑے ایسے تھے جو عام آدمی کو نظر ہی نہ آتے۔ وہ صرف کھوجی اور کسی تھانیدار کو ہی نظر آ سکتے ہیں۔ یہ بڑا مشکل اور پیچیدہ فن ہے لیکن بڑا ہی کارآمد۔

یہی کہا جاسکتا تھا کہ مقتول نے چوری چھپے رحمت بی بی سے نکاح پڑھوایا اور رات ہی رات اُسے کسی گاؤں میں لے گیا۔ وہاں اُس کے شہتہ دار ہوں گے۔ ہو سکتا ہے اُس کے دشمن بھی ہوں۔ وہ قصبے کو واپس آ رہا تھا تو راستے میں قتل ہو گیا اور عورت غائب ہو گئی۔ یہ بھی قابل غور تھا کہ مقتول رات کو کیوں واپس آ رہا تھا؟ ہمیں اب آگے دو چار گاؤں سے معلوم کرنا تھا کہ کسی نے مقتول کو وہاں سے گذرتے دیکھا تھا یا نہیں۔ یہ بھی پتہ چلانا تھا کہ کوئی اُسے جانتا تھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے؟ شام ہو چلی تھی۔ ہم خود تو آگے نہیں جا سکتے تھے۔ ہمارے ساتھ قصبے کا جو نمبر دار تھا اُسے کہا کہ وہ خود جائے یا کسی اور کو بھیجے اور یہ جو راستہ آگے کو جاتا ہے، اس کے ارد گرد کے تین چار گاؤں کے نمبر داروں اور چوکیداروں کو تھانے پہنچنے کی اطلاع دے۔

یعقوب علی کو پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی دیکھنی تھی۔ شام بھی ہو چلی تھی اس

یہ جس رحمت بی بی کی خبر لایا ہے، اُس کا خاندان خواجہ الشیخ بڑا ہی نیک اور پارسا آدمی ہے۔ صوم و صلوة کا ایسا پابند کہ اُدھر سے اُسے موت ہی بٹا سکتی ہے۔ شہر کی چاروں مسجدوں کی مرمت اور دیکھ بھال اُس نے اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ وہ کھانوں کا اڑھتی ہے۔ ذرا دیکھو یہ آدمی جسے ہم معزز کہاتے ہیں، خواجہ الشیخ جیسے آدمی کو رسوا کرنے پر اُتر آیا ہے۔“

میں ایسے ”معززین“ سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہ سارے ہندوستان میں پائے جاتے تھے۔ اب پاکستان ان سے بھرا پڑا ہے۔ ہماری حکومتیں نہیں خوب استعمال کرتی ہیں اور یہ لوگ دراصل پولیس کے مخبر ہوتے ہیں کسی بے ناہ کو خراب کرنے کے لیے پولیس کے چکر میں ڈالنا، تو یہ معززین قابلِ اعتماد جھوٹے گواہ لے آئیں گے اور بے گناہ کو گناہگار ثابت کر دیں گے۔

اس کے بعد دو اور آدمی آئے۔ دونوں نے ایک جیسی رپورٹ دی کہ کسی ایسی رحمت بی بی کا سراغ نہیں ملا جس کا نکاح کسی عبدالمجید کے ساتھ پڑھا گیا ہو۔ یعقوب علی نے مباحثوں میں سے دو چار آدمی اپنے مخبر بنا رکھے تھے۔ اُن کی طرف سے بھی یہی رپورٹ آئی کہ کسی بھی مباحثہ گھرانے میں کسی بیوہ کا کسی کے ساتھ نکاح نہیں پڑھا گیا۔

رات غالباً گیارہ بج رہے تھے کہ دو گاؤں کے نمبر دار آگئے۔ یہ قصبے کے نمبر دار کا انتظام تھا۔ ہم نے دونوں کو اکٹھے بٹھالیا اور پوچھا کہ یہاں کا ایک مولوی عبدالمجید اُن کے گاؤں کی طرف گیا ہوگا۔ انہیں ہم نے یہ بتایا کہ وہ قتل ہو گیا۔ انہیں جو آدمی بلانے آیا تھا، اُس نے بھی انہیں اس کے سوا کچھ نہ بتایا کہ انہیں

تھانے طلب کیا گیا ہے یعقوب علی نے اس آدمی کو اصل بات پوشیدہ رکھنے کی ہدایت کی تھی۔

ایک نمبر دار نے ہنس کر کہا: ”دیکھا بات ہے حضور! مولوی عبدالمجید کی بڑی پوچھ بوری ہے۔ دو روز پہلے بھی شہر کے ایک صاحب ان کو پوچھتے پھر رہے تھے۔ آج آپ پوچھ رہے ہیں۔“

”وہ کون تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم جانتے ہو اُسے جو اُسے پوچھتا پھر رہا تھا؟“

”ہاں جی!“ نمبر دار نے جواب دیا۔ ”میں اُسے بھی جانتا ہوں جو مولوی عبدالمجید کو پوچھتا پھر رہا تھا۔ میرے گاؤں سے کوئی چار کوس دُور مولوی عبدالمجید کے رشتہ دار رہتے ہیں۔ یہ میں اس لیے جانتا ہوں کہ تقریباً ایک سال گزرا، مولوی عبدالمجید ہمارے گاؤں میں مسجد کی تلاش میں آیا تھا۔ ہمارے پاس اپنے شاہ صاحب ہیں۔ وہی امامت کراتے ہیں۔ مولوی عبدالمجید کی باتیں مجھے اتنی اچھی لگیں کہ میں نے اُسے کھانے کے لیے روک لیا۔ اُس نے مجھے اُس گاؤں کا نام بتایا تھا جہاں اُس کے رشتہ دار رہتے ہیں۔ کتنا تھا کہ وہ رشتہ داروں کے سر پر فارغ نہیں بیٹھنا چاہتا۔ اس کے بعد میں شہر (قصبے میں) آتا رہا۔ تین چار دفعہ اُس سے ملاقات ہوئی تھی... اور یہ آدمی جو دو روز پہلے اُس کی پوچھتا پھر رہا تھا وہ یہاں کا کاروباری آدمی ہے۔ اُس کا کلگری کا کاروبار ہے۔ عموماً دیہات میں کھڑے درخت خریدنے کے لیے آیا کرتا ہے۔ درخت کاٹنے والے اُسے دیہات سے ملتے ہیں اور اونٹ بھی اُسے دیہات سے ہی ملتے ہیں جن پر وہ کٹے ہوئے

درختِ نادر کو لاتا ہے۔ اس کا نام خواجہ امین ہے۔
 ”خواجہ امین کب تمہارے گاؤں گیا تھا؟“ یعقوب علی نے پوچھا۔

”اور اُس نے کیا پوچھا تھا؟“

”میرا خیال ہے آج تیسرا دن ہے۔“ منبردار نے جواب دیا۔ ”میں باہر اپنے کھیتوں میں تھا۔ وہ گذر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر زک گیا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ درخت ڈھونڈتے پھر رہے ہو؟ کہنے لگا، نہیں، ایک آدمی کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ کسی نے بتایا ہے کہ وہ ادھر کے کسی گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اُس نے بلال مجید کا نام لیا تو میں نے اُسے اُس کے گاؤں کا نام اور راستہ بتا دیا، اور وہ چلا گیا۔“
 منبردار اس سے زیادہ کچھ نہ بتا سکا۔ دوسرے منبردار نے بتایا کہ ایک سال پہلے عبدالمجید اُس کے گاؤں بھی مسجد کی تلاش میں گیا تھا اور اُن کی مسجد کے امام کے ہاں ایک رات ٹھہرا تھا۔ اُس منبردار کو اُس کے متعلق اور کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔

مقتول کا چلن اچھا نہ تھا

میں وہاں کے کسی بھی آدمی کو نہیں جانتا تھا۔ یعقوب علی سے پوچھا کہ خواجہ امین کون ہے اور وہ مقتول کے پیچھے کیوں گیا ہو گا؟ یعقوب علی نے بتایا کہ خواجہ امین اُسی خواجہ اللہ بخش کی بیوی کا بھائی ہے جس کے متعلق وہ بتا چکا ہے کہ نیک اور پارسا ہے اور کھالوں کا کاروبار کرتا ہے۔
 ”لیکن میں اس خاندان کے کسی فرد پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔“ یعقوب علی

نے کہا۔ ”اگر خواجہ امین مقتول کے پیچھے گیا تھا تو مجھے یقین ہے کہ مقتول مسجد کی امامت چھوڑ کر چلا گیا ہو گا۔ شاید کسی وجہ سے ناراض ہو کر گیا ہو۔ یہ خواجہ خاندان مذہب پرست ہے۔ خواجہ امین اسے گناہ سمجھتا ہو گا کہ اُن کا امام ناراض ہو کر چلا جائے۔“

”پہلے یہ تو معلوم کر لو کہ اس مسجد کا سرپرست یہ خواجہ خاندان ہے؟“
 میں نے اُسے کہا۔ ”کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ خواجہ اسی مسجد میں نماز پڑھتے ہیں؟ معلوم کرو کہ خواجہ امین کا اس مسجد کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ اگر تم اس لیے اس خاندان پر شک نہیں کرتے کہ یہ نمازی اور پرہیزگار خاندان ہے تو میں تمہیں عقل مند تھا نیذا رہیں کہوں گا۔ تمہاری باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاندان دولت مند ہے اور کاروباری تو ہے ہی۔ میرا تجربہ کچھ اور کتا ہے۔ دولت عموماً عبادت پر غالب آجایا کرتی ہے۔“

”تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ خواجہ امین سے پوچھا جائے کہ وہ مقتول کے پیچھے کیوں گیا تھا؟“

”پوچھو گے تو کہہ دے گا کہ وہ رُوٹھ کر چلا گیا تھا اور میں اُسے منا کر واپس لانے گیا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”مقتول کو نہ تم جانتے تھے نہ میں اُس سے واقف تھا۔ اُس کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ وہ اُن پیشہ ورانہ امور میں سے تھا جو چھوٹی چھوٹی مسجدوں میں یا چھوٹے چھوٹے گاؤں کی مسجدوں میں امامت کیا کرتے ہیں اور باجماعت نماز پڑھانے کے سوا مذہب کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ مقتول کا کردار بھی مجھے اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میرے پاس اس کا

ثبوت تو کوئی نہیں لیکن میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اُس نے اس رحمت بی بی کے ساتھ اُس کی مرضی کے بغیر نکاح پڑھایا ہے اور نکاح خوال بھی خود ہی بنا تھا۔ جہاں تک میں مذہب کو سمجھتا ہوں، یہ غیر شرعی اور غیر قانونی حرکت ہے۔ اُس نے نکاح اتنا خفیہ کیوں کیا کہ کسی کو پتہ ہی نہ چلے دیا؟ پھر اُس رات اس عورت کی چوڑیاں توڑ کر کسی کو بتائے بغیر غائب ہو گیا؟.... اور اُس کی جیب سے جو چاقو برآمد ہوا ہے، اتنا بڑا کمافی دار چاقو تم جانتے ہو کون لوگ اپنے پاس رکھا کرتے ہیں؟

”تو پھر خواجہ امین سے بات کر لیتے ہیں،“ یعقوب علی نے کہا۔

”اس سے پہلے اُس گاؤں چلتے ہیں جہاں مقتول کے رشتہ دار رہتے ہیں۔“

— میں نے کہا۔ ”جو بات تمہیں وہاں سے معلوم ہوگی وہ خواجہ امین سے حاصل نہیں ہو سکتی۔“

نیر داروں کو ہم نے فارغ کر دیا اور انہیں کہا کہ تمہانے میں اُن کے ساتھ جو باتیں ہوئی ہیں، اُن کا ذکر کہیں نہ ہو۔ اُن سے ہم نے اُس گاؤں کا نام اور راستہ معلوم کر لیا تھا جہاں مقتول کے رشتہ دار رہتے تھے۔

رات گزر گئی۔ صبح کی اذان کے ساتھ میں اور یعقوب علی گھوڑیوں پر نکل کھڑے ہوئے۔ ہمارے ساتھ دو کانٹیل سائیکلوں پر تھے۔ سات میل کوئی فاصلہ نہیں تھا لیکن علاقہ ٹیلوں اور گھاٹیوں کا تھا جن کی وجہ سے وقت زیادہ لگ گیا۔ ہم اس گاؤں میں پہنچے تو سورج طلوع ہو رہا تھا۔ گاؤں چھوٹا سا تھا۔ پولیس کو دیکھ کر باہر گھومتے پھرتے لوگ جہاں تھے وہیں جام ہو گئے۔ پہلے آدمی سے ہی پوچھا تو اُس نے مقتول کے رشتہ داروں کا گھر بتا دیا۔

ہم اندر چلے گئے۔

اُس کی بیوی کسی کے ساتھ بھاگ گئی

گھر میں دو عورتیں تھیں اور ایک بوڑھا آدمی۔ پولیس کو گھر میں دیکھ کر وہ سن ہو گئے۔ یعقوب علی نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ ہم کسی کو گرفتار کرنے نہیں آئے۔ کچھ پوچھنے آئے ہیں۔ وہ غریب سے کسان تھے۔ اتنے میں ایک جوان آدمی دوڑا ہوا آیا اور ہمارے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”حضور!“ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”اگر اُس نے کوئی جرم کیا ہے تو اس میں ہمارا کوئی تصور نہیں۔ ہم نے اسے کہہ دیا تھا کہ ہم اسے اس گھر میں نہیں رکھتے۔ ہم نے اسے گھر سے نکال دیا تھا۔“

میں نے گھروالوں سے کہا۔ ”نیک بختو! بزدلوں کی طرح گھبرا نہ جاؤ چارپائی لاؤ۔ ذرا بیٹھ کر بات کریں گے۔“

ایک چارپائی لانے کے لیے سارے گھر میں ہڑبنگ مچ گئی۔ چارپائی بھی تو ہم بیٹھ گئے۔

”اب بتاؤ تم کس کی بات کر رہے تھے؟“ یعقوب علی نے اس جوان آدمی سے پوچھا۔ ”پوری بات سناؤ۔“

”میں مجید سے کی بات کر رہا تھا جی!“ اُس نے کہا۔ ”لوگ اسے مولوی عبدالمجید کہتے ہیں۔“

”وہ کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہاں سے چلا گیا تھا جی!“ اُس نے جواب دیا۔

”عورت اُس کے ساتھ گئی تھی؟“

”اسی لیے تو ہم نے اُسے گھر سے نکال دیا تھا جی، کہ وہ معلوم نہیں کس

کی عورت ساتھ لے آیا تھا۔“ اُس نے کہا۔ ”اس عورت کو لے جانے کے لیے پہلے ایک آدمی آیا تھا پھر دو آئے تھے۔“

”اب پوری بات سنادو۔“ میں نے کہا اور اُسے بتایا کہ وہ بات کہاں سے شروع کرے اور ذرا اسی باتیں بھی سنائے۔

اُس نے بتایا کہ عبدالمجید اُس کا چچا زاد بھائی ہے۔ وہ لوگ ساتھ والے ضلع کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ وہاں اُن کی ایک اور خاندان کے ساتھ دشمنی پیدا ہو گئی۔ لڑائیاں ہوتیں۔ پولیس تک بھی معاملہ گیا۔ مقدمے بھی چلے اور لڑائیاں پھر بھی جاری رہیں۔ عبدالمجید کے باپ نے دشمن خاندان کے ساتھ بھجوتہ کر لیا اور ان لوگوں کو بھی جن کے گھر ہم بیٹھے ہوئے تھے، کہنے لگا کہ راضی نامہ کر لو۔

یہ لوگ راضی نہ ہوئے۔ آخر یہ لوگ تنگ آ کر وہاں سے یہاں آ گئے جہاں اب آباد تھے۔ یہ کوئی تیس سال پہلے کا واقعہ تھا۔ اُس وقت عبدالمجید کی عمر پانچ پچھ سال تھی۔ وہ بڑا ہوا تو ایک روز ان لوگوں کے ہاں آیا اور انہیں کہا کہ وہ ان کی رشتہ داری کو قائم رکھنا چاہتا ہے۔ یہ بڑھاپا جو ہمارے سامنے بیٹھا تھا، عبدالمجید کا چچا تھا۔ عبدالمجید کا باپ مرجھا چکا تھا۔

اس کے بعد عبدالمجید ان کے ہاں آتا رہا۔ اُس نے اپنا آبائی پیشہ ترک کر دیا اور کسی مولوی کا شاگرد بن گیا۔ ان لوگوں کا ذریعہ معاش کاشتکاری تھا عبدالمجید

نے یہ ذریعہ چھوڑا تو گھر میں فاقہ ہونے لگے۔ اس کا چھوٹا بھائی بڑا ہوا تو وہ لوگوں کی کھیتی باڑی کرنے لگا۔ عبدالمجید ادھر ادھر گھومتا رہا۔ آخر اُس نے ایک گاؤں کی مسجد سنبھال لی۔ اس شخص میں کوئی خرابی نہیں تھی۔ اس کی عادتیں بھی بڑی نہیں تھیں۔ اُس نے غلطی صرف یہ کی کہ اپنا پیشہ چھوڑ دیا۔

پھر اُس کی شادی ہو گئی۔ چار سال تک ایک بھی بچہ پیدا نہ ہوا۔ پانچویں سال اُس کی بیوی لاپتہ ہو گئی۔ وہ اُسے ڈھونڈتا رہا مگر کوئی سراغ نہ ملا۔ ایک سال بعد اُسے کسی نے بتایا کہ اُس نے اُس کی بیوی کو تلم میں کہیں دیکھا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک آدمی تھا جس نے بڑے اچھے کپڑے پہن رکھے تھے اور وہ خوبصورت جوان تھا۔ عبدالمجید کا دماغ خراب ہو گیا۔ وہ جہلم چلا گیا اور اُس نے اپنی بیوی کی تلاش میں دو سال گزار دیے۔ وہ جب واپس آیا تو اُس کی حالت فقیروں جیسی تھی۔ سائیں منگ بنا ہوا تھا۔

اس حالت میں وہ خانقاہوں، مزاروں اور پیروں کے گھروں میں ماتھا رکھتا اور یا علی حیدر کے نصرے لگاتا رہا۔ اب کوئی ایک سال سے اُس کی حالت سنبھل رہی تھی۔ اُس نے پھر مسجدوں میں وقت گزارنا شروع کر دیا اور اُس کا دماغ ٹھکانے آ گیا۔ اُس کا دراصل دماغی توازن بگڑ گیا تھا جو اپنے آپ ہی ٹھیک ہو گیا۔

ایک روز وہ اس گاؤں میں اپنے چچا کے ہاں آیا۔ اُس نے صاف سُتھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ داڑھی سلیقے سے تراشی ہوئی تھی۔ چچا سے اُس نے کہا کہ وہ کسی مسجد کی تلاش میں ہے جہاں وہ اللہ سے دل لگا کر ساری عمر اس مسجد میں

گزار دے گا۔ وہ دو تین روز چپا کے گھر ٹھہرا پھر آگے چلا گیا۔

عورت کہتی تھی ”وہ کہہ ہوا ہے“

ہمیں بتایا کہ اس عورت کو خاوند نے اس لیے طلاق دی تھی کہ اس کے چال چلن پر شبہ تھا اور مجید سے کو خواب میں اشارہ ملا تھا کہ اس عورت سے بھولے بھٹلے ایک گناہ ہو گیا ہے، تم اس کے ساتھ شادی کر لو اور اسے اور زیادہ گناہوں سے بچا لو، ورنہ خاوند سے آزاد ہو کر یہ گناہ سگار ہو جائے گی....

”مجید نے ہمیں بتایا کہ اُس نے اس کے ساتھ گناہوں کی موجودگی میں نکاح کیا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی دھوکہ نہیں ہوا۔ وہ کہتا تھا کہ تم لوگ اس راز کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس عورت پر شیطان کا قبضہ ہو گیا ہے۔ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اسے شیطان سے آزاد کرواؤں....

”حضور! ہم ان پڑھ اور گنوار لوگ ہیں۔ ہم اس کی بات مان گئے۔ وہ حدیث اور قرآن پاک کی باتیں کرتا تھا۔ عورت کو اُس نے ساتھ والے کمرے میں بٹھا دیا۔ وہ روتی تھی۔ مجید نے اندھا جاکر دروازہ بند کر لیا۔ بہت دیر بعد باہر نکلا۔ اس کے بعد عورت کچھ نہ بولی....

”دوسرے دن پچھلے پھر شہر کا ایک آدمی آپ کی طرح مولوی عبدالمجید کو پوچھتا ہمارے گھر آیا۔ مجید گھر تھا۔ وہ آدمی اُسے باہر لے گیا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ان دونوں کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔ مجید بہت دیر بعد آیا۔ ہم نے اُس سے پوچھا کہ یہ آدمی کون تھا۔ اُس نے بتایا کہ یہ شہر (قبضہ) کا ایک نیک اور پارسا آدمی تھا۔ مجید سے پوچھنے آیا تھا کہ یہ عورت تمہیں پریشان تو نہیں کر رہی۔ اس کے ساتھ میرا نکاح اسی آدمی نے پڑھایا تھا۔ اس نے بھی مجھے کہا تھا کہ اس عورت کی زندگی سنوار دو۔ یہ جوان ہے اور کوئی آدمی اسے قبول کرنے کو تیار نہیں کیونکہ اس پر تہمت لگی ہے۔ اگر اس کی

”اب کوئی چار پانچ روز پہلے کا واقعہ ہے کہ وہ آدمی رات کے بعد آیا۔“
مقتول کے چچا زاد بھائی نے سنا یا۔“ اُس کے ساتھ ایک جوان عورت تھی کپڑوں اور زیورات سے اور شکل و صورت سے وہ کسی امیر گھر کی عورت لگتی تھی۔ مجید نے بتایا کہ یہ اُس کی بیوی ہے۔ اسے طلاق ہو چکی ہے۔ عورت کہنے لگی کہ اُس نے اُسے دھوکے سے بیوی بنا لیا ہے اور وہ اُس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ ہم نے مجید سے کہا کہ اسے جہاں سے لائے ہو وہیں چھوڑ آؤ، ورنہ ہم سب کو بھینساؤ گے۔ اُس نے جیب سے ایک کاغذ نکالا اور ہمیں دکھا کر کہا کہ یہ نکاح نامہ ہے۔ گاؤں میں کوئی پڑھا لکھا ہے تو اُسے دکھاؤ۔ ہم نے اس کاغذ پر ایک ہی چیر پیمانی۔ یہ ایک انگوٹھا تھا جو عورت کا تھا....

”ہم نے عورت سے پوچھا کہ مجید نے اُس کے ساتھ نکاح پڑھایا ہے یا نہیں۔ عورت نے کہا کہ نکاح ضرور ہوا ہے لیکن اسے چاہیے کہ مجھے طلاق دے دے۔ میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ ہم یہ سمجھے کہ اس عورت کو مجید نے سبز باغ دکھائے ہوں گے اور بتایا ہوگا کہ وہ بہت امیر آدمی ہے۔ اس عورت نے ہاں کر دی ہوگی۔ اب گاؤں میں اگر اس پر حقیقت کھلی ہے۔ مجید نے عورت کو دھوکہ دی کہ وہ چپ نہ ہوئی تو وہ اُسے قتل کر دے گا۔ عورت چپ ہو گئی۔ مجید نے

دوسری شادی نہ ہوئی تو یہ گناہگار ہو جائے گی....

”ہم نے مجید سے کی یہ بات بھی مان لی۔ اس سے اگلے دن ہی آدمی ایک اور آدمی کو ساتھ لے کر آیا اور وہ مجید سے کو باہر لے گئے۔ مجید بہت دیر بعد واپس آیا اور اس نے وہی بات سنائی جو ایک روز پہلے سنائی تھی۔ اب ہمیں کچھ شک ہوا۔ عورت میری ماں اور بہن نے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ عورت کو مجید نے شاید ڈرا دیا تھا۔ وہ روتی تھی اور اصل بات نہیں بتاتی تھی۔ اتنا ہی کہتی تھی کہ اس کے ساتھ دھوکہ دیا ہے اور وہ اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی....

”میرے باپ (مقتول کے چچا) نے اور میں نے مجید سے سے کہا کہ وہ سچ بات بتادے۔ ہم اب ماننے کے لیے تیار نہیں تھے کہ شہر کے معزز آدمی اس کے پاس یہ پوچھنے آتے ہیں کہ عورت اُسے پریشان تو نہیں کر رہی۔ کیا شہر میں مجید سے سے بہتر کوئی اور آدمی نہیں تھا؟ مجید سے نے وہی بات دہرائی جو وہ پہلے کہہ چکا تھا۔ ہم نے اُسے کہا کہ وہ عورت کو واپس شہر لے جائے یا اپنے گاؤں لے جائے... ہم غریب لوگ ہیں جسور اہم ڈرتے تھے کہ کسی مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ یہیں لپکا شک ہو گیا تھا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ مجید اکرے کا دروازہ بند کر کے اس عورت کے پاس بیٹھا رہتا تھا....

”اس سے اگلے دن کی شام کا واقعہ ہے کہ دو آدمی آئے۔ وہ بھی مجید سے کو باہر لے گئے۔ کچھ دیر بعد وہ مجید سے کے ساتھ واپس آئے اور مجید انہیں اس کمرے میں لے گیا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ ان میں کیا باتیں ہوتی رہیں۔ میرے باپ نے مجید سے کو باہر بلایا اور کہا کہ اب ہم اُسے اور اس عورت کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتے اور

وہ ابھی میاں سے نکل جائے۔ دراصل جی! اب گاؤں کے لوگ بھی ہم سے پوچھنے لگے تھے کہ تمہارے گھر یہ اجنبی لوگ کیوں آتے ہیں اور یہ عورت کون ہے؟ آپ خود سب کچھ سمجھتے ہیں جی، لوگوں کو کچھ اور شک ہونے لگا تھا۔ ہم نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ گاؤں کے بڑے ہم پر کوئی اٹا سیدھا الزام لگا بیٹھیں اور ہمارے لیے جواب دنیا مشکل ہو جائے، ہم اس عورت کو ہی چلتا کر دیں....

”ہم نے مجید سے کو مجبور کر دیا کہ وہ اس عورت کو لے کر یہاں سے چلا جائے، ورنہ ہم گاؤں کے بڑوں کو بلا کر اُسے اور عورت کو ان کے سامنے کھڑا کر دیں گے۔ وہ کمرے میں چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد وہ ان دو آدمیوں اور عورت کے ساتھ چلا گیا۔ آج آپ آگے ہیں۔ میں نے جو کچھ بتایا ہے بالکل سچ بتایا ہے۔ ہم یہ باتیں مجید سے کے سامنے بیٹھ کر بھی کہیں گے۔ ہم پر آپ کوئی شک نہ کریں۔“

میں نے اور یعقوب علی نے اس سے اور اس کے باپ سے کچھ اور باتیں پوچھیں۔ ان کی عورتوں سے اُس عورت کے متعلق بہت کچھ پوچھا۔ وہ عورت یقیناً رحمت بی بی تھی۔ اُس نے ان عورتوں کو نہیں بتایا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ وہ مقتول سے ڈری ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مجھے یہ شک تھا کہ قاتل ہی لوگ ہو سکتے ہیں۔ میں نے اس ٹمک کے پیش نظر ان پر بہت جرح کی۔ وہ بہت پریشان ہوئے۔ بوڑھے کے آنسو نکل آئے۔

ہم انہیں یہ بتائے بغیر کہ ان کا مجید قتل ہو گیا ہے وہاں سے آگئے۔ اب ہم مایوس نہیں تھے۔ پردے اٹھنے لگے تھے۔ مجھے بڑا اچھا شغل مل گیا تھا اور میرا نشہ پورا ہو رہا تھا۔

بیوی کو کسی غیبی چیز نے غائب کر دیا

اللہ مشکلیں آسان کر دیا کرتا ہے۔ ایک بات واضح ہو گئی تھی کہ پہلا آدمی جو مقتول کے پاس اس گاؤں میں گیا تھا وہ خواجہ امین تھا۔ اس کا گواہ ایک غباردار تھا۔ میں یہ سمجھا کہ خواجہ امین نے اس عورت کا نکاح مقتول کے ساتھ زبردستی پڑھایا ہے۔ یعقوب علی کتنا تھا کہ مقتول نے سب کے ساتھ دھوکہ کیا ہے۔ ہم تھانے میں پہنچے تو خدا نے ہمارے لیے وہاں ایک اور روشنی پہنچا رکھی تھی۔ یہ روشنی ہمیں تھانے کے مخبر اور جاسوسی کے نظام کے ذریعے ملی تھی۔

ایک "معزز مخبر" ہمارے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اُس سے پوچھا کہ وہ کیا خبر لایا ہے۔ اُس نے کوئی اہم بات نہ سنائی۔ اُس کی لائی ہوئی خبر ہمارے کسی کام کی نہیں تھی۔ ہم گاؤں سے جو کچھ سُن کر آئے تھے، اس کی روشنی میں اس آدمی سے خواجہ امین کے متعلق کچھ معلوم کرنا ضروری سمجھا۔ مجھے شباب ہونے لگا کہ خواجہ امین خواہ کیسا ہی نیک آدمی ہو، اگر قتل میں اُس کا ہاتھ نہیں تو رحمت بی بی کے نکاح کے ساتھ اُس کا گہرا تعلق ہے۔ وہ مقتول کے پیچھے کیوں گیا تھا؟ اُسے باہر کیوں لے گیا تھا؟ اس کے ساتھ کیا باتیں کی تھیں؟

میں نے اس معزز مخبر سے پوچھا کہ خواجہ امین کی پرائیویٹ زندگی کے متعلق کیا جانتا ہے۔

اُس نے بتایا کہ خواجہ امین شہر کا سرکردہ آدمی ہے۔ مذہب کے کاموں میں

اور لوگوں کی بھلائی کے کاموں میں پیش پیش رہتا ہے۔
"کیا وہ اپنے مہنوی خواجہ اللہ بخش کی طرح مذہب میں ڈوبا ہوا ہے؟"
یعقوب علی نے پوچھا۔

"اتنا نہیں۔" اُس نے جواب دیا۔ "خواجہ امین چالاک اور ہر شیا آدمی ہے۔ وہ جو رنگ چاہے اپنے اوپر چڑھا لیتا ہے۔ خواجہ اللہ بخش کا اٹھنا بیٹھنا اُس اپنے جیسے آدمیوں کے ساتھ ہے لیکن خواجہ امین کا دوستانہ شہر کے غنڈوں سے اور بد معاشوں کے ساتھ بھی ہے۔"

اس کے ساتھ اس صحن میں باتیں کرتے کرتے بات ذرا دور نکل گئی، بلکہ بات خواجہ خاندان کے گھر میں داخل ہو گئی۔ ہمارے اس مخبر نے اس خاندان کی مستورات کی تعریف کی۔

"... لیکن اب اس خاندان میں کچھ گڑبڑ ہوئی ہے۔" اُس نے کہا۔ اب ہم گپ شپ لگا رہے تھے اُس لیے اُس نے یہ بات گپ شپ کے انداز سے سنائی۔ کہنے لگا۔ "خواجہ اللہ بخش کی پڑوسی عورتوں نے یہ بات پھیلانی ہے کہ اُس کی بیوی کمیس ادھر ادھر ہو گئی تھی۔ وہ پردہ نشین عورت ہے۔ میں نہیں مانتا وہ اپنی ہوش میں ادھر ادھر ہو گئی ہوگی، لیکن لوگوں کو کسی گھر کی ذرا سی بات معلوم ہو جائے تو وہ اُسے بڑا دلچسپ قصہ بنا دیتے ہیں۔"

"کیا قصہ بنایا ہے لوگوں نے؟" یعقوب علی نے اشتیاق سے پوچھا۔
میرے بھی کان کھڑے ہوئے۔

"خواجہ اللہ بخش کے دو بچے چھوٹے ہیں۔" اُس نے کہا۔ "ایک صبح"

تین چار دن ہوئے، دلوں پتے دور ہے تھے اور بے بے، بے بے پکار رہے تھے۔ وہ ماں کو بے بے کہتے ہیں۔ ایک پڑوسی عورت کسی کام سے اُن کے گھر میں گئی خواجہ اللہ بخش بچوں کو بہلا رہا تھا اور بہت پریشان تھا۔ اس عورت نے اس سے پوچھا کہ ان کی ماں کہاں ہے۔ خواجہ نے بتایا کہ اپنے ماں باپ کے گھر گئی ہے، ابھی آ جائے گی۔ یہ عورت واپس آگئی۔ بچوں کی ماں نہ آئی۔ خواجہ اللہ بخش اپنے کام پر بھی نہ گیا۔ اس کے سسرال دوسرے محلے میں ہیں....

”دہی عورت بچوں کے رونے کی آواز پر پھر وہاں چلی گئی اور خواجہ اللہ بخش سے کہا کہ کسی ماں ہے کہ بچوں کو روتا چھوڑ گئی ہے۔ انہیں ساتھ لے جاتی۔ اُس نے خواجہ سے کہا کہ وہ اُسے بلاتی ہے۔ خواجہ نے اُسے کہا کہ وہ نہ جائے، ابھی آجائے گی، لیکن اس عورت نے پڑوس کا حتیٰ ادا کرنا ضروری سمجھا۔ خواجہ اللہ بخش کے روکنے کے باوجود وہ اُس کے سسرال چلی گئی۔ اُس کی زبانی یہ بات سب کو معلوم ہوئی۔ بچوں کی ماں اپنے ماں باپ کے گھر نہیں گئی تھی۔ اس عورت نے ہاں بتایا کہ اُس کے بچے رو رہے ہیں اور وہ معلوم نہیں کہاں چلی گئی ہے....

”اُدھادوں گذر گیا۔ بچوں کی ماں نہ آئی۔ پھر کوئی اور عورت اس کے گھر گئی تو اُسے بھی اللہ بخش نے یہی بتایا کہ اُن کی ماں اپنے ماں باپ کے گھر گئی ہے، ابھی آجائے گی۔ شاید یہ عورت بھی خواجہ کے سسرال چلی گئی۔ ہماروں کی خواجہ کی ساس آگئی۔ خواجہ کا ایک بیٹا دس گیارہ سال کا ہے۔ اُس نے اپنی نانی کو بتایا کہ بے بے تو روتا کہہ رہی ہیں چلی گئی تھی، پھر وہ سو گیا تھا۔ معلوم نہیں واپس آئی تھی یا نہیں۔ یہاں سے معاملہ خراب ہو گیا۔ اتنی لمبی غیر حاضری جڑی عجیب تھی۔ خواجہ اللہ بخش کوئی تسلی بخش

جواب نہ دے سکا پھر لوگوں نے دیکھا کہ خواجہ امین بھی آگیا۔ اب لوگ تماشائی بن گئے مگر کسی کو پتہ نہ چلا کہ یہ معاملہ کیسے۔ آخر وہ کل رات واپس آئی ہے۔ عورتوں کو اُس نے بتایا ہے کہ جانے وہ کیسا شر شرارت تھا کہ اُسے اُٹھا کر لے گیا۔ اُسے کچھ یاد نہیں کہ وہ کہاں رہی۔ وہ جب گھر آئی تو اُسے پتہ چلا کہ وہ گھر میں ہے۔ لوگ اسی بات کو سچ مانتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ خواجہ اللہ بخش کوئی وظیفہ کر رہا تھا جس میں اس سے بدرجہا بڑی ہو گئی۔ یہ اس وظیفے کا اُٹا اثر ہے کہ اُس کی بیوی کو کسی شبی چیز نے غائب کر دیا ہے۔“

وہ کچھ چھپایا تھا

یہ شخص چلا گیا تو میں نے یعقوب علی سے کہا کہ میرا خیال ہے کہ ہم اس غیبی چیز کو جانتے ہیں جس نے تمہاری رحمت بی بی عمر تیس سال کو غائب کیا تھا۔ ”اگر ایسا ہی ہے تو یہ میری سر دس کا بڑا ہی عجیب و غریب بلکہ ہر کسی کو حیران کر دینے والا کیس ہوگا۔“ یعقوب علی نے کہا۔ ”اس خاندان کی کسی عورت کو شر شرارت ہی گھر سے لے جاسکتا ہے۔“

اب خواجہ امین کو تھانے بلانے کا ہمارے پاس معقول جواز آگیا تھا۔ اُسے بلانے کے لیے ایک بغیر وردی کانٹیلن بھیجا۔ وہ فوراً آگیا۔ اُس کے ساتھ یعقوب علی نے میرا تعارف یہ کرایا کہ میں سی۔ آئی۔ اے کا انسپکٹر ہوں اور مجھے خاص طور پر پولی عبدالمجید کے قتل کی تحقیق کے لیے بلایا گیا ہے۔ اس ملاقات میں سی۔ آئی۔ اے

اس کی اُس نے بڑی لمبی روئیدار منافی شروع کر دی۔ اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ مجھ پر سیتاثر پیدا کر رہا ہے کہ وہ صمت مذہبی انسان ہے اور اللہ کے گھر کا شیدائی۔

”مولوی عبدالمجید کی مسجد کے ساتھ آپ کی کیا دلچسپی تھی؟“ میں نے پوچھا۔
”کیا یہ مسجد آپ کی سرپرستی میں ہے؟“

اُس کی زبان ہلکا گئی۔ کچھ کتے کتے ڈک گیا اور گھونٹ سا نکل کر کہنے لگا۔
”میں اس مسجد میں کبھی نہیں گیا۔ میرے گھر کے قریب ایک مسجد ہے۔ اس میں نماز پڑھنے جایا کرتا ہوں۔ جمعہ جامع مسجد میں پڑھتا ہوں۔“

”سنا ہے مولوی عبدالمجید کسی وجہ سے ناراض ہو کر چلا گیا تھا۔“ میں نے کہا۔
”اور آپ اُسے واپس لانے کے لیے اُس کے گاؤں گئے تھے؟“

”ہاں۔ ہاں۔“ وہ ہاں ہاں کہہ کر چُپ ہو گیا، پھر اُس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اُس کی آنکھیں ادھر ادھر دیکھ کر مجھ پر جم گئیں۔

میں نے اُسے کچھ بھی نہ کہا۔ اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ وہ میری نظروں کا سامنا نہ کر سکا۔ اُس نے نظریں جھکا لیں پھر یعقوب علی کی طرف دیکھا۔

”خواجہ صاحب!“ یعقوب علی نے کہا۔ ”آپ تو اس طرح گھبرا گئے ہیں جیسے میری اور آپ کی پہلی ملاقات ہوئی ہو۔ آپ پہلی بار تھانے میں نہیں آئے۔ خدا نخواستہ آپ مجرم تو نہیں۔ ان سے سزا دیں۔ یہ میرے دوست ہیں آپ جانتے ہیں کہ عزیز سا مولوی قتل ہو گیا ہے۔ آپ چونکہ اُس کے گاؤں گئے تھے اس لیے آپ سے کچھ پوچھ رہے ہیں تفتیش میں ہیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“

کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ لوگ سی۔ آئی۔ ڈی کو جانتے تھے لیکن اسے ”خفیہ پولیس“ کہا کرتے تھے، اس لیے یعقوب علی نے سی۔ آئی۔ اے کی بجائے خفیہ پولیس کہہ دیا تھا۔ اس علاقے کے لوگ خفیہ پولیس کو شر شر سمجھا کرتے اور اس سے ڈرتے تھے۔ میں ہندوستان کے جن علاقوں میں سروس کر آیا تھا وہاں کے جرائم پیشہ لوگ سی۔ آئی۔ اے سے بڑی اچھی طرح واقف تھے۔

میں خواجہ امین کو پہلی بار دیکھ رہا تھا اس لیے میں جان نہ سکا کہ اس کا چہرہ ہمناش بشاش رہنے والا ہے یا اسی طرح گھبرا یا گھبرا رہتا ہے۔ بہر حال اُس کے چہرے پر جو تاثر تھا وہ گھبراہٹ کا تھا۔ میں نے اُس کی گھبراہٹ دور کرنے کی ذرا سی بھی کوشش نہ کی۔ میری نظر میں وہ مجرم تھا، خواہ اعانت جرم کا ہو۔ قتل کے ساتھ اُس کا تعلق ضرور تھا۔

”خواجہ صاحب!“ میں نے اُسے کہا۔ ”مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ شہر کے معزز آدمی ہیں اور مذہب کے ساتھ آپ کو دینی لگاؤ ہے۔ میں آپ سے امید رکھوں گا کہ آپ غلط بیانی نہیں کریں گے۔ اپنی عزت کا خاص خیال رکھیں۔ میں آپ کی عزت بچانے کی پوری کوشش کروں گا۔“

میں اُس کے چہرے کو بڑی غور سے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے چہرے کا رنگ نمایاں طور پر بدل رہا تھا جیسے صاف آسمان پر دھند چھا رہی ہو۔ اُس کے ہونٹ خشک ہو گئے جو شدید گھبراہٹ کی نشانی ہوتی ہے۔

”آپ کی زیادہ تر دلچسپیاں کس مسجد سے ہیں؟“
”جامع مسجد سے۔“ اُس نے کہا اور اس مسجد کے لیے وہ جو کچھ بتاتا تھا،

”جی۔ میں گیا تھا۔“ اُس نے کھسیانی سے مسکراہٹ سے کہا ”میں ہاں لیا تھا۔ اُسے کہا تھا کہ وہ واپس آجائے۔“

”پھر وہ آگیا تھا؟“

”نہیں آیا۔“ اُس نے قزاق دیا۔ ”نہیں مانا۔“

”ناراضگی کیا تھی؟“

”اُس نے کچھ بتایا نہیں۔“ اُس نے پیلے سے زیادہ ہکلاتے ہوئے کہا

”بس... بس یہی کہتا تھا کہ اب وہاں نہیں جاؤں گا۔“

”آپ اس مسجد میں کبھی نہیں گئے تھے۔“ میں نے کہا ”آپ کو کس نے

بتایا تھا کہ مولوی عبدالمجید ناراض ہو کر چلا گیا ہے اور اُسے واپس لے آئیں؟“

اب اُس کی گھبراہٹ دیکھنے والی تھی۔ اُس کے ہونٹ ہلتے تھے۔ اندر سے

زبان بھی ہلتی ہوگی لیکن اُس کی آواز نہیں نکلتی تھی۔ بڑی مشکل سے اُس کے منہ سے

نکلا ”اوجی! بات یہ ہے کہ... دراصل...“

”خواجه صاحب! میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔“ جواب

دینے سے پہلے یہ سوچ لیں کہ آپ جس کا بھی نام لیں گے کہ اُس نے آپ سے کہا تھا

کہ مولوی عبدالمجید کو جاکر واپس لے آئیں، ہم اُس آدمی کو تھانے بلائیں گے اور آپ

سے الگ اُس سے آپ کے بیان کی تصدیق کرائیں گے۔ میں آپ کو پھر یاد دلاتا ہوں

کہ آپ اس قصبے کے معزز فرد ہیں۔ یہاں کے لوگ آپ کی عزت کرتے ہیں۔ ہماری

مدد کریں کہ ہم آپ کی عزت قائم رکھیں۔ اگر آپ ہمیں وہ بات بتا دیں گے جو آپ

چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں تو ہم آپ کو حوالات میں بند تو نہیں کر دیں گے۔

ہم انسان ہیں۔ اچھے بُرے کا اُس کی حیثیت کے مطابق خیال رکھتے ہیں۔ اگر کوئی ایسی دسی بات ہے تو وہ خاموشی سے طے ہو سکتی ہے۔ چھپائی جاسکتی ہے۔ آپ گھبرائیں نہیں۔“

اُس کے چہرے پر ہلکی سی رونق آگئی۔

”اچھا؟“ اُس نے پوچھا۔ ”بات طے ہو سکتی ہے؟“

”کیوں نہیں خواجه صاحب!“ میں نے کہا۔ ”بات تو کریں!“

میں نے جرم کرنے والوں میں عمر گزار دی تھی۔ میں گھنٹوں ایسے مجرموں کے ساتھ

گفتگو اور جرح کیا کرتا تھا جن کا پیشہ چوری، ڈاکہ اور رہزنی تھا اور ایسے مجرموں کے

ساتھ بھی میرا وقت گزرتا تھا جو مجھو لے بھٹکے یا کسی خاص وجہ سے جرم کر بیٹھتے

تھے۔ ہر مجرم پولیس کی جرح سے گھبرا کر اقبال جرم تک آ جاتا ہے لیکن وہ اس طرح

پیچھے ہٹ آتا ہے جیسے اُسے کسی نے آگے سے دھکے دیا ہو۔ وہ ادھر ادھر کی

بانکنے لگتا ہے۔ اُس وقت اُس کے چہرے پر ایک خاص تاثر ہوتا ہے جسے عقل مند

تھا نیدار فوراً سمجھنا پڑتے ہیں۔ میں نے وہ تاثر خواجه امین کے چہرے پر دیکھا میں

ابھی اُسے قائل نہیں کہہ سکتا تھا لیکن یہ بات صاف تھی کہ وہ کوئی بات جس کا تعلق

قتل سے تھا، چھپا رہا تھا۔ اُس نے ایک بار بیکارسی ایک بات کہہ دی۔

بہن کی خاطر سوئے پر آگیا

”خواجه صاحب!“ میں نے کہا۔ ”مجھے ان سوالوں کے جواب دے دیں

اور تشریف لے جائیں۔ آپ کو کس نے کہا تھا کہ مولوی عبدالمجید ناراض ہو کر چلا گیا ہے اور اُسے واپس لے آئیں؟ پہلے روز آپ گئے تو وہ نہ مانا۔ دوسرے دن آپ جس آدمی کو ساتھ لے گئے تھے، وہ کون تھا؟ اور تیسرے دن آپ نے جن دو آدمیوں کو وہاں بھیجا تھا، وہ کون تھے؟... اور سب سے زیادہ ضروری سوال یہ ہے کہ وہ رحمت بی بی کون ہے جس کے ساتھ مولوی عبدالمجید نے نکاح پڑھایا تھا؟ یہ خیال رکھیں کہ ہم آپ کو سوچنے کے لیے کوئی وقت نہیں دیں گے اور جب تک آپ ان سوالوں کے صحیح جواب نہیں دیں گے آپ تھانے سے باہر نہیں جاسکیں گے۔

”آپ مجھے یہ اجازت دیں کہ دوسرے روز میں جسے ساتھ لے گیا تھا اسے اپنے ساتھ لے آؤں۔“ اُس نے کہا۔ ”میں فوراً آ جاؤں گا۔“ میری ہنسی نکل گئی۔ ”خواجہ امین صاحب!“ میں نے اُسے کہا۔ ”آپ لکڑی کے کسی بیوپاری کے ساتھ بات نہیں کر رہے۔ آپ کے سامنے دو تھانیدار بیٹھے ہیں۔“

یہ تو اب واضح ہو چکا تھا کہ اس شخص کا جرم کے ساتھ تعلق ہے۔ اگر وہ ذرا سادھی چالاک اور ہوشیار ہوتا تو کہہ سکتا تھا کہ مجھے کچھ بھی معلوم نہیں لیکن وہ فطرت کے لحاظ سے مجرم نہیں تھا۔ وہ صرف بھلا رہا تھا اور گھبرا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کے پاؤں کے پنجے سے ساری زمین کھینچ لی جائے۔ مجھے یہ شک نہیں تھا کہ جس رحمت بی بی کے ساتھ مقتول کا نکاح ہوا تھا وہ خواجہ امین کی بہن یعنی خواجہ اللہ بخش کی بیوی تھی۔ خواجہ اللہ بخش زندہ و سلامت تھا۔ اُس نے اپنی بیوی کو طلاق نہیں دی تھی۔ اُس کا نکاح مقتول کے ساتھ کس طرح ہو سکتا تھا۔

مجھے ایک اور شک ہو رہا تھا ضروری نہیں تھا کہ خواجہ اللہ بخش مذہبی آدمی تھا تو اُس کی بیوی بھی ایسی ہی ہو۔ پولیس اچھی طرح جانتی ہے کہ انسان کیسے حیران کن جرائم کیا کرتے ہیں۔ کسی جرم پیشہ آدمی کی بیوی کا نیک پاک ہونا اور کسی پارا کی بیوی کا بدچلن ہونا کوئی عجوبہ نہیں۔ میں نے ایسے کئی کیس دیکھے تھے۔ یہ نکاح مجھے فراڈ لگتا تھا جو مقتول نے کیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ خواجہ اللہ بخش کی بیوی مقتول کے ساتھ چلی گئی ہو۔ اُس کے غائب ہوجانے کی شہادت تو بی بی گئی تھی۔ وہ اُس رات واپس آئی جس رات مولوی عبدالمجید قتل ہوا تھا۔ اُس کا کھڑا قبے سے جا نہیں رہا تھا، دیہات سے آ رہا تھا۔

”خواجہ صاحب!“ میں نے پوچھا۔ ”آپ کی بہن کا نام رحمت بی بی ہے نا؟ وہ جو خواجہ اللہ بخش کی بیوی ہے؟... وہ کہاں غائب ہو گئی تھی؟“ میں نے اُس کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ اُس کا رنگ لاش کی طرح پھیکا سفید ہو گیا۔ اُس نے پھر بھی سنبھلنے کی کوشش کی اور بھلا کر بولا۔ ”وہ تو جی، کوئی شر شرار تھا۔ ہم نے...“

”خواجہ صاحب!“ میں اب تھانیداروں کے لہجے میں بولا۔ ”مجھے بہت پہلے پتہ چل چکا تھا کہ آپ جھوٹ بول رہے ہیں اور ہمیں پکڑ دے رہے ہیں۔ کیا آپ ابھی تک نہیں سمجھے کہ ہم نے بہت کچھ معلوم کر کے آپ کو بلایا ہے؟ کیا آپ کو اپنی عزت کا کوئی خیال نہیں؟“ میں اٹھ کھڑا ہوا اور یعقوب علی سے کہا۔ ”یعقوب! ایک کانٹیلبل کو خواجہ اللہ بخش کے گھر بھیجو جو اُس کی بیوی کو تھانے لے آئے۔“ خواجہ امین پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو، پھر یک لمحہ وہ بیدار ہو گیا اُس

نے روکنے کے اغاز سے دونوں ہاتھ میرے آگے کر دیے اور ہڑبڑا کر بولا۔ ”ذرا بیٹھئے۔ میری ایک عرض سن لیں۔۔۔۔۔ آپ نے کہا تھا کہ معاملہ ہمیں طے ہو سکتا ہے۔“
 ”میں اب بھی یہی کہتا ہوں۔“ یعقوب علی نے کہا۔ ”لیکن آپ وہ بات تو بتائیں جس کا معاملہ طے کرنا ہے۔“

”آپ جانتے ہیں خدا نے مجھے بہت دیا ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”اس میں سے کچھ آپ کی خدمت میں پیش کر دوں تو مجھے خوشی ہوگی۔ آپ خود حکم کریں۔ جو کہیں گے پیش کر دوں گا۔“

”ہمیں سودا منظور ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن یہ تو پتہ چلے کہ اصل بات کیا ہے۔ تھانوں میں کیا نہیں ہوتا۔ یہاں تو قتل بھی گول ہو جاتے ہیں۔ آپ ہمیں ساری بات بتادیں تاکہ ہم آپ کے لیے اور اپنے لیے کوئی راستہ نکالیں۔ آپ درخت دیکھ کر سودا کیا کرتے ہیں نا؟“

وہ جتن تھے

”آپ پکا وعدہ کرتے ہیں؟“ اُس نے کاہنتی ہوئی آواز میں کہا۔
 ”خواجہ صاحب!“ میں نے کہا۔ ”گھر آئے ہوئے مال کو کون چھوڑتا ہے؟ لیکن میں آپ کو یہ بتا دوں کہ ہم منہ مانگا مال لیں گے۔ ہم دو ہیں اور اُدھر والوں کو بھی کچھ دینا ہے۔“
 اُس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”خالی چیک دستخط کر کے دے دوں گا۔“

رقم آپ لکھیں گے۔“

”یہ سارا معاملہ عزت کا تھا۔“ اُس نے کہا۔ ”ایک روز مجھے اطلاع ملی کہ میری بہن کہیں چلی گئی ہے اور بچے رو رہے ہیں۔ پہلے میری والدہ گئی۔ کچھ دیر بعد واپس آئی تو وہ بہت پریشان تھی۔ اُس نے بتایا کہ رحمت بی بی کو بہت سے گھروں میں جا کے دیکھا ہے۔ کہیں بھی نہیں ملی۔ میں گیا۔ میرا بہنوئی خواجہ اللہ بخش بھی بہت پریشان تھا۔ کہا تھا کہ اُسے کچھ پتہ نہیں رحمت بی بی کہاں ہے۔ وہ ادھر ادھر ہوا تو اُس کا بڑا بچہ جس کی عمر گیارہ بارہ سال ہے میرے قریب آیا اور اُس نے مجھے بڑی عجیب بات بتائی۔ کسے لگا کہ رات کو آبا اور بے بے شاید یہ سمجھتے تھے کہ میں سو گیا ہوں۔ دونوں بیٹھک میں چلے گئے۔ بیٹھک میں کوئی اور بھی تھا۔ میں نے دروازہ ذرا سا کھول کر دیکھا۔ وہاں ایک داڑھی والا آدمی بیٹھا تھا اور دو اور آدمی تھے۔ ان کی بھی داڑھیاں تھیں۔ بے بے ایک کونے میں سر جھکا کر بیٹھی ہوئی تھی۔ بے بے تو پردہ کرتی ہے۔ میں حیران ہوا کہ وہ باہر کے ان آدمیوں کے سامنے کیوں بیٹھی ہے۔ ایک داڑھی والے نے ایک جھٹکھولا۔ اس پر کچھ لکھتا رہا۔ پھر اس پر بے بے کا انگوٹھا لگوا دیا گیا۔ آبا نے اُس آدمی کو بہت سے پیسے دیے۔ سب آہستہ آہستہ باتیں کرتے رہے پھر وہ اُٹھے اور بے بے اُن کے ساتھ چلی گئی۔ میں دوڑا جا پراپائی پر لیٹ گیا۔ صبح اُتار سے پوچھا کہ بے بے کہاں گئی ہے۔ آبا نے کہا کہ ابھی آجائے گی۔ وہ نہ آئی تو میں نے آبا سے کہا کہ وہ رات کو اُن آدمیوں کے ساتھ کہاں گئی ہے۔ آبا نے مجھے یہ کہہ کر ڈرا دیا کہ وہ جتن تھے۔ وہ تمہاری بے بے کو لے گئے ہیں۔ آج شام تک واپس لے آئیں گے۔۔۔۔۔

”وہ بچہ تھا۔ ڈر گیا مگر ماں کی جدائی نے بچے کے دل سے ڈر نکال دیا اور اُس نے مجھے بتا دیا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے خواب دیکھ رہا ہوں۔ کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ معاملہ کیا ہے۔ میں نے خواجہ اللہ بخش سے پوچھا کہ بچہ کیا کہتا ہے؟ رحمت بی بی کہاں ہے؟ اُس کے آنسو نکل آئے اور بولا۔ ”بچہ ٹھیک کہتا ہے لیکن میرے ساتھ دھوکہ ہو گیا ہے۔ یہ دھوکہ مُسنے سے پہلے میں آپ کو یہ بتا دوں کہ خواجہ اللہ بخش خطبی اور وہی آدمی ہے۔ شریعت کا اتنا پابند کہ بیوی بچوں کو جھول جاتا ہے۔ اگر صبح دکان کھولتے پہلے بایاں پاؤں دکان میں چلا جائے تو فوراً پاؤں پیچھے کر لیتا ہے۔ توبہ استغفار پڑھتا ہے، پھر ایک دُعا پڑھ کر پہلے دایاں پاؤں دکان میں رکھتا ہے۔۔۔“

”طبیعت کا سخت ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر میری بہن کو ٹوکتا اور ڈانٹتا ہے۔ میری بہن کی طبیعت اور عادت کچھ اور ہے۔ خوش طبع عورت ہے۔ خواجہ اللہ بخش نے مجھے بتایا کہ وہ باہر سے آیا تو رحمت بی بی گھر نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ آگئی تو خواجہ اللہ بخش نے بڑے غصے سے اُسے کہا کہ میں گھر آیا بیٹھا ہوں اور تم شہر آؤ اور پھر رہی ہو۔ رحمت بی بی کہاں تھی ایسی تمت برداشت کرنے والی۔ اُس نے ایک کی دو سنائیں اور خواجہ اللہ بخش کی بہنوں کو آوارہ اور بد معاش کہہ دیا۔ خواجہ اللہ بخش غصے کا بہت تیز ہے۔ اُس نے اور زیادہ بکواس کی۔ میں بیوی میں بڑی سخت تو تکار ہو گئی۔ خواجہ اللہ بخش شاید اس حرکت کو غیر شرعی سمجھتا ہو گا کہ بیوی خاوند کے مُنہ آئے۔ اُس نے کہہ دیا۔ ”جاؤ مجھ پر حرام ہے۔ میں نے تمہیں طلاق دی میں نے تمہیں طلاق دی۔ میں نے تمہیں طلاق دی۔“ اس طرح اُس نے تین طلاقیں پوری

کر دیں۔۔۔“

”اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ خواجہ اللہ بخش کے دل میں میری بہن کی بہت قدر اور محبت ہے۔ اپنے بچوں کے ساتھ تو اُسے محبت ہے ہی۔ رحمت بی بی نے طلاق قبول کر کے اپنا سامان اکٹھا کرنا شروع کر دیا اور بچوں سے کہا کہ چلو نانا نانی کے گھر چلیں۔ خواجہ صاحب کا غصہ بالکل بجھ گیا اور اُس نے رحمت بی بی سے کہا کہ مجھے معاف کر دو۔ رحمت بی بی طلاق سے خوش تو نہیں تھی، وہ ڈل گئی مگر خواجہ اللہ بخش شریعت کا پابند ہے۔ اُس نے رحمت بی بی سے کہا کہ وہ اُسے تین طلاق دے چکا ہے۔ لہذا اب وہ اُس پر حرام ہے۔ اپنی مطلقہ بیوی کو اپنے اوپر حلال کرنے کا شرعی طریقہ ہے حلالہ۔ چنانچہ اُس نے حلالہ کرنا ضروری سمجھا۔“

ایک رات کا خاوند

میں نے شرعی قوانین و ضوابط کا گہرا مطالعہ نہیں کیا اس لیے شریعت کی اصطلاحات میں بات نہیں کر سکتا۔ چند ایک موٹے موٹے اور روزمرہ کے استعمال کے شرعی قوانین جانتا ہوں۔ حلالہ ایک شرعی طریقہ کار ہے۔ شہر دل میں اس سے کہی ہوئی لوگ واقف ہیں۔ دیہات میں اس سے ہر کوئی آگاہ ہے۔ اس کا استعمال اُس وقت ہوتا ہے جب کوئی آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے دے لیکن اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور وہ اسی عورت کو بیوی بنانا چاہے۔ اس کا شرعی طریقہ یہ ہے کہ اس عورت کا نکاح کسی اور آدمی کے ساتھ پڑھا جائے اور یہ عورت صرف ایک رات

کے لیے اُس کی بیوی رہے گی۔ اگلی صبح یہ آدمی اُسے طلاق دے دے گا اور اُس کا خاوند اُس کے ساتھ نکاح پڑھالے گا۔ اسے حلالہ کرنا کہتے ہیں۔

دیہات میں اکثر یوں ہوتا ہے کہ کوئی خاوند غصے میں آکر اپنی بیوی کو ایک دین طلاق کہہ دیتا ہے لیکن خواجہ اللہ بخش کی طرح اُسے غصہ اُترتے ہی پچھتاوا ہوتا ہے مگر شریعت کی رو سے بیوی اُس پر حرام ہو چکی ہوتی ہے۔ لہذا حلالہ ضروری ہوتا ہے۔ دیہات میں پیشہ ور حلالہ کرنے والے بھی مل جاتے ہیں جو اصل خاوند سے کچھ رقم لے کر صرف کاغذی خاوند بنتے ہیں عملاً نہیں اور ایسی مثالیں بھی سامنے آتی ہیں کہ حلالہ کرانے کی خاطر اپنی مطلقہ بیوی کو کسی "رضا کار" کے ساتھ ایک رات کے لیے بیاہ دیا گیا اور اگلے روز اُس نے طلاق دینے سے انکار کر دیا۔ بعض اوقات اس میں ایک رات کے میاں بیوی کی مرضی شامل ہو جاتی ہے۔ بیوی کہہ دیتی ہے کہ وہ اب اسی کی بیوی رہے گی۔ اُس سے بیوی نہیں چھڑائی جاسکتی کیونکہ نکاح باقاعدہ پڑھا جاتا ہے اور نکاح کی کاغذی کارروائی مکمل ہوتی ہے۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے "رضا کار" خاوند کو خاصی رقم دی جاتی ہے اور اس کے لیے رقم الگ دی جاتی ہے کہ وہ صرف کاغذی خاوند رہے۔ دیہات میں مسجدوں کے بعض مولوی ایک رات کا کاغذی خاوند بننے کا پیشہ کرتے ہیں۔

خواجہ امین کا بہنوئی خواجہ اللہ بخش بڑی سختی سے شریعت پرست تھا۔ اس سختی سے اُس نے بیوی اپنے اوپر حرام قرار دے دی اور اسی شدت سے اُس نے محسوس کیا کہ وہ اس بیوی (رحمت بی بی) کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خواجہ امین نے اپنے بیان میں لکھا کہ خواجہ اللہ بخش نے اُسے بتایا کہ اُس نے حلالہ کے لیے کسی موزوں

اور قابل اعتماد آدمی کی تلاش شروع کی جس نے ایک دوست سے بات کی۔ دوست بھی شریعت کا پابند تھا۔ اُس نے خواجہ اللہ بخش سے کہا کہ حلالہ واقعی لازمی ہے۔ اس دوست نے عبدالمجید مقتول کو موزوں آدمی سمجھا کیونکہ وہ چپ چاپ اور مرابطہ آدھی تھا۔

مقتول کے ساتھ بات ہوئی۔ اُسے لگایا کہ اُسے ایک سو روپیہ حلالہ کی نفیس دی جائے گی اور دو سو روپیہ اس کی نفیس کہ وہ کاغذی خاوند رہے اور بیوی کے جسم سے دُور رہے۔ عبدالمجید نے اس پابندی کی تین سو نفیس مانگی لیکن اٹھائی سو روپیہ پر سودا ہو گیا۔ اُن دنوں ساڑھے تین سو روپیہ بہت بڑی رقم ہوا کرتی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ مقتول کی جیب سے تین سو پچپن روپیہ برآمد ہوا تھا۔ اُس نے ساڑھے تین سو روپیہ وصول کیا تھا۔ اُسے اگلی صبح روشنی سے پہلے رحمت بی بی کو طلاق دے کر خواجہ اللہ بخش کے گھر بھیج دیا تھا۔

خواجہ اللہ بخش نے خواجہ امین کو بتایا کہ نکاح خوان کی ضرورت تھی۔ مولوی عبدالمجید نے کہا کہ چونکہ وہ خود نکاح پڑھا سکتا ہے اس لیے کسی اور نکاح خوان کی ضرورت نہیں۔ خواجہ اللہ بخش نے یہ اس لیے تسلیم کر لیا کہ نکاح درپردہ پڑھنا تھا اور ساری کارروائی خفیہ رکھنی تھی۔ چنانچہ دو گواہ جو خواجہ اللہ بخش کے دوست اور ہم خیال تھے، شام کے بعد خواجہ کے گھر بلائے گئے۔ رحمت بی بی کو بیٹھک میں بٹھا دیا گیا اور اُسے شریعت کا حکم سمجھا کر نکاح پڑھا دیا گیا۔

رحمت بی بی کی مولوی عبدالمجید کے ساتھ رخصتی بھی لازمی تھی چنانچہ مولوی عبدالمجید رحمت بی بی کو ساتھ لے گیا۔

مولوی صاحب ولی معلوم ہوتے ہیں

صبح کی اذان کے وقت، خواجہ اللہ بخش عبدالمجید کے گھر اپنی بیوی کو اُس سے طلاق دلوانے اور واپس لانے گیا تو وہاں تالا لگا ہوا تھا۔ اس کے بعد نہ عبدالمجید نظر آیا نہ رحمت بی بی۔ خواجہ اللہ بخش کے لیے بڑی اذیت ناک مشکل پیدا ہو گئی۔ وہ پولیس کو رپورٹ دینے سے ڈرتا تھا۔ رحمت بی بی اب قانونی طور پر عبدالمجید کی بیوی تھی۔ گھر میں اُسے بچے پریشان کرنے لگے۔

”میں نے جب خواجہ اللہ بخش سے یہ واردات سنی تو مجھے آگ لگ گئی“ خواجہ امین نے بیان دیتے ہوئے کہا۔ ”شرعیات اپنی جگہ ہے لیکن جتنا اسنے اُوچے گھر کی عورت کو عبدالمجید جیسا ایک بھکاری لے جائے، بہت بڑی بے غیرتی ہے۔ خواجہ اللہ بخش رور تھا۔ وہ بہت سیدھا آدمی ہے۔ اُس کے ہوش ایسے گم ہوئے کہ اُس نے کسی سے یہ بھی نہ پوچھا کہ مولوی عبدالمجید کہاں کا رہنے والا تھا تا کہ اُس کا تعاقب کیا جاتا۔ وہ ساڑھے تین سو روپیہ بھی لے گیا اور عورت بھی لے گیا تھا۔ شرعیات کا تو میں بھی پابند ہوں لیکن میرے تعلقات ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ ہیں....

”میں نے عبدالمجید کے جاننے والوں سے معلوم کر لیا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔ اُس کے گاؤں کا نام تو معلوم نہ ہو سکا یہ پتہ چل گیا کہ گاؤں کس طرف ہے۔ میں ذرا خریدنے کے لیے بہت سے دیہات میں جاتا رہتا ہوں اس لیے اس علاقے سے

پوری واقفیت ہے۔ میں اُدھر کو چل پڑا۔ راستے میں ایک منبر دار مل گیا۔ اُس سے پوچھا تو اتفاق سے وہ عبدالمجید کو جانتا تھا۔ اُس نے اُس کے رشتہ داروں کا گاؤں بتا دیا۔ وہاں گیا۔ عبدالمجید مل گیا۔ اُسے باہر لے جا کر پوچھا کہ اُس نے طلاق کیوں نہیں دی۔ اُس نے صاف جواب دیا کہ رحمت بی بی اُس کی منکر ہے۔ قانون اور شریعت کے لحاظ سے وہ اُس کی بیوی ہے۔ وہ طلاق نہیں دے گا....

”وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے اُسے پانچ سو روپیہ پیش کیا جو اُس نے قبول نہ کیا۔ اُس نے ایک ہزار روپیہ بھی ٹھکرا دیا اور کہنا کہ اُسے پاکستان کا پورا صوبہ دے دو تو بھی وہ اس عورت کو طلاق نہیں دے گا۔ میں واپس آگیا۔ دوسرے دن ایک آدمی کو ساتھ لے گیا۔ اُس نے بھی عبدالمجید سے بہت کچھ کہا لیکن وہ نہ مانا۔“

خواجہ امین نے اس آدمی کا نام دینے بھی بتایا اور اُس کے متعلق یہ رائے دی کہ وہ بہت چالاک اور پتھر کو بھی موم کر دینے والا آدمی ہے مگر وہ اس پتھر کو موم نہ کر سکا۔ اُس نے فوراً دوسرا حربہ استعمال کیا۔ وہ خواجہ امین پر برس پڑا۔ کہنے لگا۔ ”میں نے مولوی صاحب کو پہلی بار دیکھا ہے۔ ان کے ماتھے پر آپ نے ستارہ نہیں دیکھا؟ یہ تو بیخ والی شخصیت ہے اور آپ لوگ انہیں پریشان کر رہے ہیں۔ کیا آپ خدا کا شکر ادا نہیں کرتے کہ آپ کی بہن کو یہ خاوند مل گیا؟ جو اگلے جہان تمہارے سارے خاندان کو بہشت میں لے جائے گا؟ ان سے معافی مانگو خواجہ صاحب! یہ مولوی صاحب تو ولی معلوم ہوتے ہیں۔“ خواجہ امین نے یہی بتایا کہ اس آدمی نے ایسی کمال کی اداکاری کھی کہ

خواجہ امین سمجھتے ہوئے بھی متاثر ہو گیا۔ اُس نے عبدالمجید کو آسمان پر چڑھا دیا۔ اُس کے آنکھ کے اشارے پر خواجہ امین نے جھک کر مقتول کے پاؤں چھوئے اور ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی اور کہا ”میں آپ کو اپنا سبنوئی تسلیم کرتا ہوں۔“

اس شخص نے جس کا نام خواجہ امین نے عاشق حسین بتایا تھا، خواجہ امین سے کہا ”خواجہ صاحب! اللہ کی دی ہوئی بزرگی اور کرامات مولوی صاحب کے پاس ہے اور دولت آپ کے پاس ہے۔ آپ انہیں واپس لے چلیں اور کچھ پیسہ خرچ کر کے ان کا گھر آباد کر دیں۔ ہم انہیں بڑی مسجد کی امامت دلائیں گے۔“

”لیکن خواجہ امین نے جس پر سے پیسے چڑھانے کا“ عبدالمجید نے کہا۔ ”آپ کے پاس نکاح نامہ ہے“ خواجہ امین نے کہا۔ ”رحمت بی بی کا وارث میں ہوں۔ کوئی آپ کی طرف آنکھ اٹھا کر کبھی نہیں دیکھے گا۔“

معلوم ہوتا ہے کہ عبدالمجید بڑی کمزور شخصیت کا آدمی تھا جو چھوٹکے میں آ گیا۔ بعد میں جب میں اُس آدمی سے ملا جس نے اُسے رام کیا تھا تو میں مان گیا کہ وہ کسی کا دماغ اپنے قبضے میں لینے کے فن کا ماہر ہے۔

خواجہ امین اور اُس کا دوست مقتول کے گھٹنے چھو کر اور یہ وعدہ لے کر آ گئے کہ وہ بیوی کو لے کر شہر میں آجائے۔ انہوں نے اُسے کہا کہ کل یا پرسوں شام دو آدمی اُسے لینے آئیں گے۔

اُس کے دن پورے تھے

خواجہ امین اور عاشق حسین جب واپس آ رہے تھے تو عاشق نے خواجہ

سے کہا کہ شیخس طلاق نہیں دے گا اور یہ صورت کسی قیمت پر قابل قبول نہیں کہ اُس کی بہن اس اُجڑے آدمی کی بیوی بنی ہے۔ اس سے رحمت بی بی کو بچھڑانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ یہ زندہ نہ رہے۔ اگر اس سے ہم رحمت بی بی کو بچھین کر لے گئے تو خواجہ امین بخش اس کے ساتھ شادی نہیں کر سکے گا کیونکہ شیخس اُسے طلاق نہیں دے گا۔ اس شخص کا مرنا ضروری ہو گیا ہے۔

قتل کی سکیم بتاتے ہوئے خواجہ امین ڈر گیا۔ ہماری حوصلہ افزائی سے اور اس وعدے سے کہ ہم اُس کے ساتھ معاملہ طے کر لیں گے، اُس نے سب کچھ بتا دیا۔ خواجہ امین کا میل ملاقات ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ تھا اور اُس کے پاس بیسی بھی تھا۔ عاشق حسین چلتا پڑتا اور دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے والا آدمی تھا۔ قصبے کے ساتھ ہی قبرستان تھا جس میں منگوں کا ٹکیر تھا۔ منگوں کو آپ جانتے ہیں، چرس اور بھنگ پیتے اور ہر جرم کر گزرتے ہیں۔ خواجہ امین نے اپنے دوست کی مدد سے ایک منگ کی خدمات حاصل کیں اور اُس کے ساتھ سودا طے کر لیا۔

عاشق حسین بھی مجرا نذہنیت کا آدمی تھا۔ ضرورت دو آدمیوں کی تھی لیکن اس دوست نے خواجہ امین سے کہا کہ کام بڑا خطرناک ہے اس لیے وہ خود منگ کے ساتھ جائے گا۔ وہ بظاہر دوستی کا حق ادا کر رہا تھا لیکن اُس نے خواجہ امین کو اپنا کیا مشکل بتائی۔ خواجہ امین سمجھ گیا کہ وہ اُجڑے مانگ رہا ہے۔ اس نے اس دوست کو اڑھائی ہزار روپیہ نقد دے دیا۔ یہ اُس وقت کی بہت زیادہ رقم تھی۔ منگ کو پانچ سو روپے پیشگی دیے گئے۔ وہ دوبارہ کا سزا یافتہ تھا اور پولیس کے ریکارڈ پر تھا۔

اگلی شام وہ دونوں مقتول کے گاؤں چلے گئے۔ اسی رات سے کچھ دیر پہلے وہ واپس آ گئے۔ اُس وقت خواجه امین، خواجه اللہ بخش کے گھر بیٹھا تھا۔ وہ بتانی سے رحمت بی بی اور ان دو آدمیوں کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے دم خشک ہو رہے تھے۔ خواجه امین کے بیان کے مطابق انہیں بالکل توقع نہیں تھی کہ وہ کامیاب ٹھہریں گے۔ خواجه اللہ بخش تسبیح ہاتھ میں لیے کوئی وردِ وظیفہ کر رہا تھا۔ آخر انتظار ختم ہوا اور سب سے پہلے رحمت بی بی گھر میں داخل ہوئی۔ اُس نے پہلی سرگوشی یہ کی تھی۔ ”یہ دو آدمی کون ہیں؟ انہوں نے اُسے جان سے مار دیا ہے۔“ وہ کانپ رہی تھی۔ اُس کے بھائی اور خاوند نے اُسے تسلی دی اور کہا کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ عاشق حسین اور ملنگ بیٹھک میں بٹھائے گئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ مقتول کے گاؤں گئے تو وہ جیسے اُن کی انتظار میں تھا۔ عاشق حسین نے اداکاری کا جادو چلایا اور مقتول کو رحمت بی بی کے ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا۔ اس چرب زبان شخص نے مقتول سے کہا کہ اُس نے بہت سے سرکردہ افراد اپنے ساتھ ملا لیے ہیں اور اب کوئی خطرہ نہیں۔ اُس نے مقتول کو باتوں میں دلی اور قلب بنادیا۔

میں وہ تمام باتیں جو اُس نے مقتول کے ساتھ کیں، لکھ نہیں سکتا کیونکہ یہ بڑی لمبی باتیں ہیں۔ آپ یہ ذہن میں رکھیں کہ سید صاحب اسد اعبدا الحمید اُن کے جھانے میں آگیا۔ اس کے لیے ایک مشکل یہ بھی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ چچا کے گھر میں رہتا تھا۔ ان لوگوں نے اُسے کہہ دیا تھا کہ وہ اس عورت کو میاں سے لے جائے۔ مختصر یہ کہ اُس کے دن پرے ہو چکے تھے۔ اُس کی موت کا ہر سبب آسانی سے کامیاب ہوتا جا رہا تھا۔ اُسے قتل کرنے کا طریقہ یہ سوچا گیا تھا کہ پیچھے سے ملنگ اُس کے گلے میں تسی

پھینکے گا اور عاشق حسین اُسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لے گا۔ یہ طریقہ ملنگ نے سوچا تھا۔ مقتول کو قصبے سے بہت دور پیچھے ختم کرنا تھا لیکن جوں ہی ملنگ رسی پھینکنے کے لیے پیچھے ہوتا، مقتول اتفاق سے پیچھے دھکیلتا یا ادھر ادھر ہو جاتا۔ موقع نہ ملنے کی وجہ سے قصبہ قریب آگیا۔ عاشق حسین نے مزید انتظار بہتر نہ سمجھا۔ اُس نے چلتے چلتے مقتول کے پیلو کی طرف ہو کر اُسے بازوؤں میں اس طرح جکڑ لیا کہ مقتول کے بازو بھی جکڑے گئے۔

”چل اوئے۔“ عاشق حسین نے ملنگ کو لٹکارا۔

ملنگ تیار تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے رسی مقتول کے گلے میں ڈالی اور گانٹھ دے کر رسی کے سرے پورے زور سے کھینچے۔ مقتول کچھ دیر تڑپا، ملنگ رسی کے سرے اور زیادہ کھینچتا رہا۔ مقتول مر گیا۔ عاشق حسین نے اُس کی نبض دیکھی۔ دل پر ہاتھ رکھا۔ وہ مر چکا تھا۔ رحمت بی بی کی چیخ نکل گئی۔ وہ دونوں اُسے گھر لے گئے۔

خواجه اللہ بخش اور خواجه امین نے انہیں شاباش دی اور شکر یہ ادا کیا۔ دونوں قاتلوں کو اجرت مل چکی تھی مگر عاشق حسین نے مزید رقم کا مطالبہ کر دیا۔ پانچ سو اپنے لیے اور پانچ سو ملنگ کے لیے۔ خواجه امین نے اُسے کہا کہ وہ پہلے ہی اتنی زیادہ رقم دے چکا ہے۔ عاشق حسین نے کہا کہ نہ دیں۔ ہم تھانے چلے جاتے ہیں۔ یہ عاشق حسین نے بیک میلنگ کا پہلا وار کیا تھا۔

خواجگان نے انہیں پانچ پانچ سو روپیہ مزید دے دیا اور دونوں قاتل چلے گئے۔

شب عروسی غیر مرد کے ساتھ

خواجہ امین ہر آدمی کی نشاندہی کرتا چلا جا رہا تھا۔ ان سب کو اسی روز گرفتار کر لیا گیا۔ خواجہ امین کو بھی حالات میں بند کر دیا گیا۔ خواجہ اللہ بخش قتل میں شریک نہیں تھا۔ اُس کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ کچھ دیر غمی میں رہتا اور بیدار ہو کر کوئی بات کرتا تھا۔ اُس نے نکاح کے دوران گواہوں کے نام پتے بتا دیے۔ دونوں کو گواہوں کی فہرست میں رکھا گیا۔ ہم نے سوچ سوچ خواجہ اللہ بخش کو بھی گرفتار کر لیا۔

رحمت بی بی بھی گواہ تھی۔ شریف اور بامزت گھرانے کی پردہ نشین عورت کی جیسے جان ہی نکلی ہوئی تھی۔ اُس کے ساتھ پہلے ہی زیادتی ہوئی۔ خاندان نے اُسے ایک دو تین طلاق کہہ دیا تھا تو اس میں عورت کا کوئی قصور نہ تھا لیکن سزا اسی کو ملی۔ اُس کا نکاح ایک جاوڑ کی طرح کے آدمی سے پڑھا دیا گیا۔

ہم نے بڑی مشکل سے اُس سے بیان لیا۔ اُسے یقین دلایا گیا تھا کہ شریعت کا حکم پورا کرنے کے لیے محض کاغذی کارروائی ہو رہی ہے اور صبح کی روشنی سے پہلے وہ اپنے گھر آجائے گی۔ وہ اطمینان سے مقتول کے ساتھ اُس کے گھر چلی گئی۔ وہ پردہ نشین عورت تھی۔ مقتول اس کے لیے غیر مرد تھا۔ اُس نے گھونگھٹ نیچے کیے رکھا مگر مقتول نے اُسے کہا کہ وہ اُس کی شرعی بیوی ہے اور اب اُس کی بیوی رہے گی۔

رحمت بی بی نے اُسے بتایا کہ اُس کا خیال غلط ہے۔ اگر اُس نے اسے چھڑا تو وہ گھر چلی جائے گی۔ مقتول نے اُسے کہا کہ نکاح نامہ اُس کے پاس ہے جس پر اُس

نے انگوٹھا لگایا ہے۔ وہ اب جہاں بھی چلی جائے گی، وہ پولیس اور عدالت کے حکم سے اُسے واپس لے آئے گا۔ رحمت بی بی نے اُس کی منت سماجت کی مگر مقتول پر وحشی پن سوار ہو چکا تھا۔ رحمت بی بی نے اپنے آپ کو بچانے کی بہت کوشش کی۔ بستر پر اور فرش پر یہیں چوڑیوں کے جواتے زیادہ ٹکڑے ملے تھے وہ اسی کوشش میں ٹوٹے تھے۔

مقتول نے وہ چاقو نکال لیا جو اُس کی لاش سے برآمد ہوا تھا۔ اُس نے رحمت بی بی سے کہا ”میرا دنیا میں کوئی نہیں میں تمہیں قتل کر کے پھانسی بھی چڑھا دوں گا تو میری بیوی ہے نہ کوئی بچہ جو میرے بغیر مجھ کے مر جائیں گے۔“

پردہ نشین اور شریف عورت کہاں تک مقابلہ کرتی۔ اُس نے ہمیں بیان دیتے ہوئے کہا تھا ”اُس کی شکل خوفناک ہو گئی تھی اور اُس کی آنکھوں میں خون اُترا ہوا صاف نظر آتا تھا۔ مجھ پر غشی طاری ہونے لگی۔“

مقتول نے اُس پر غشی طاری نہ ہونے دی اور رحمت بی بی مار گئی۔ چاقو کی نوک پر وہ اُسے شہر سے باہر لے گیا۔ راستے میں وہ اُسے ڈراتا دھمکتا رہا کہ اُسے کسی کو اصل حقیقت بتائی تو وہ اُسے قتل کر دے گا۔ وہ اُسے اپنے چچا کے گاؤں لے گیا۔ وہاں وہ اُسے ڈراتا دھمکتا بھی تھا اور منت سماجت بھی کرتا تھا۔ وہ بچاؤ کی ڈرتی اصل بات نہیں بتاتی تھی۔ اتنا ہی کہتی تھی کہ اس کے ساتھ نہیں رہوں گی۔

یعقوب علی نے کیس تیار کرنے کے لیے مجھے اپنے پاس روکے رکھا۔ ہم نے بڑی محنت سے کیس تیار کیا۔ پولیس نے اٹھارہ گواہ پیش کیے تھے۔ میں اس کیس میں قاتلانی تھا۔ مجسٹریٹ کی عدالت سے کیس سیشن کورٹ میں گیا۔ بڑا دمپسپ کیس تھا۔

سیشن کورٹ نے عاشق حسین، ملنگ اور خواجہ امین کو عمر قید کی سزا دی۔ خواجہ امین بخش اور نکاح کے دونوں گواہوں کو ایک ایک سال سزائے قید دی گئی۔ ان کے خلاف یہ الزام تھا کہ انہوں نے سرکاری ریکارڈ (نکاح رجسٹر) میں اپنی مرضی اور مفاد کے مطابق غلط اندراج کیا یعنی نکاح خوان اُسی کو بنایا جس کا نکاح پڑھا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ جرم کیا کہ رحمت بی بی مطلقہ نہیں بلکہ شادی شدہ تھی کیونکہ عدالت میں تحریری طلاق نامہ پیش نہ کیا گیا۔ زبانی طلاق کو عدالت نے تسلیم نہ کیا۔ پھر انہوں نے ایک جرم یہ بھی کیا کہ رحمت بی بی کے وارث زندہ تھے۔ اُن سے اُس کے نکاح کی اجازت نہ لی گئی۔ وہ نکاح میں شریک تھے۔

ہائی کورٹ نے اپیلیں مسترد کرتے ہوئے سزائیں بحال رکھیں۔ اس حادثے سے ایک اور حادثہ یہ ہوا کہ رحمت بی بی اپنے بھائی اور خاوند کی سزائیں سُننے ہی دماغی توازن کھو بیٹھی۔ ڈیڑھ ایک سال بعد اس قصبے کے ایک آدمی سے ملاقات ہوئی۔ اُس نے بتایا کہ رحمت بی بی کا کچھ پتہ نہیں کہاں چلی گئی ہے۔



دولت، تکبر اور تیزاب

دولت کا نشہ انسان کو کس طرح بے دین اور بدکار بنا دیتا ہے؟ میری ایک تفتیش کی روئیداد پڑھیں تو آپ کو جواب مل جائے گا اور یہ روئیداد آپ کو انسانی فطرت کے کچھ اور پہلو بھی دکھائے گی۔ یہ قصہ بڑا ہی پُرانا ہے لیکن ہمارے معاشرے میں اس ڈرامے کو پُرانا نہیں ہونے دیا گیا۔ یہ دہلی کا واقعہ ہے۔ دہلی کے ایک محلے کا کیس سی۔ آئی۔ اے کے سپرد کیا گیا۔ واردات پندرہ سولہ روز پُرانی ہو گئی تھی۔ متعلقہ تھانے کا تھانیدار کوئی سراغ نہیں لگا سکا تھا۔ ایسے اکثر کیس عدم پتہ قرار دے کر فائلوں میں دفن کر دیے جاتے ہیں۔ کوئی خاص کیس سی۔ آئی۔ اے کے سپرد ہوتے تھے۔ ان "عاصل" لوگوں میں وہ بھی شامل تھے جو انگریزی حکومت کے منظور نظر تھے۔ اس واردات کا شکار ایک مسلمان امیر زادہ ہوا تھا۔ میں صبح نام اور مقام لکھ کر اس خاندان کی نشان دہی نہیں کرنا چاہتا۔ اسی لیے دہلی کے اس محلے کا نام بھی نہیں لکھ رہا۔ جہاں افراد کے نام کی ضرورت محسوس ہوئی وہاں فرضی نام لکھوں گا۔ واردات یہ تھی کہ ایک امیر کیہ گھر لے کر جاواں سال آدمی، زنانہ رات

کو ایک گلی میں سے گذر رہا تھا۔ وہ گلی کا موڑ مڑا تو وہاں کوئی آدمی گھات میں تھا۔ اُس نے زمان کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا۔ سارا چہرہ بُری طرح جل گیا۔ آنکھیں بالکل اندھی ہو گئیں۔ گردن، کندھے اور سینے کا بھی کچھ حصہ جل گیا۔ زمان درد سے چیخنے چلا، بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ وہ تیزاب پھینکنے والے کے پیچھے دوڑنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

پندرہ سولہ دنوں بعد اس واردات کی تفتیش سی۔ آئی۔ اے کے سپرد کر دی گئی اور یہ مجھے سونپی گئی۔ سی۔ آئی۔ اے میں فرشتے نہیں ہوتے تھے۔ پولیس کے اس شعبے کے اختیارات خاصے وسیع تھے۔ سی۔ آئی۔ اے کے طریقہ تفتیش میں تشدد اور ایذا رسانی (تھرو ڈاگری) کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ اسی لیے اسے دُری جتھہ کہا جاتا تھا۔ دُری موٹے چہرے کی ایک چیز ہوتی تھی جس کی شکل بھانڈوں کے طمانچے سے ملتی جلتی تھی۔ دُری کو عموماً بھگو کر رکھتے تھے اور مشتبہ آدمی کو مُرغا بنا کر کمر کے نیچے گولہوں کے درمیان مارتے تھے۔ اس کی ضرب پتھر جیسے لمزموں کی چٹیں نکال دیتی تھی۔ پنجاب میں مشہور تھا کہ سی۔ آئی۔ اے کا سارا کمال چہرے کی دُری میں ہے لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس شعبے کے لیے تعلیم یافتہ اور ذہین پولیس افسروں کو منتخب کیا جاتا تھا۔

میں واردات والے علاقے کے تھانے میں گیا۔ ایس۔ ایچ۔ او سب پٹر کبیر ناٹھ تھا۔ اس سے تمام تر معلومات لیں۔ گانڈوں پر جو کچھ آچکا تھا، اس کا مطالعہ کیا۔ مشتبہ افراد کی فہرست دیکھی۔ ہر ایک کے متعلق پوچھا کہ اسے کیوں شامل تفتیش کیا گیا ہے۔ اور بھی بے شمار باتیں تھیں جو کبیر ناٹھ سے معلوم

کیں۔ مجھے بتایا گیا کہ زمان کا خاندان پنجابی ہے لیکن کاروبار چونکہ دہلی میں تھا اس لیے یہ لوگ دہلی کے ہی ہو کے رہ گئے۔ اُن کے پانچ چھ گھرانے تھے۔ یہ لوگ تاجر بھی تھے اور زمیندار بھی۔ زمان ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اُس کا باپ آرمی کنٹرولنگ اور سپلائی تھا۔ دہلی اور گڑگاؤں کے درمیان کہیں اُس کی بہت سی زمین بھی تھی جو زیر کاشت تھی۔ زمان کی دو بہنیں تھیں۔ دونوں کی شادی ہو چکی تھی۔ زمان کے متعلق بتایا گیا کہ شہزادہ تھا۔ اُس کی شادی ہوئے چھ مہینے گذر چکے تھے۔ چال چلن اچھا نہیں تھا۔ چال چلن کے لحاظ سے تو سارا خاندان کچھ ایسا دوسرا ہی تھا۔ دولت کی فراوانی نے اُن کے ماں نہ اخلاق رہنے دیا تھا، نہ مذہب۔ فوج کی ٹھیکیداری اور رشوت لازم و ملزوم ہوتی ہیں۔ سپلائی سے تعلق رکھنے والے فوجی افسروں کو خوش رکھنا پڑتا ہے۔ اُن کی ہر فرمائش پوری کرنی ہوتی ہے۔ انہی افسروں سے دس کے سو وصول کیے جاتے ہیں۔ لیکن دین کا یہ سلسلہ انگریزوں کے دورِ حکومت میں بھی چلتا تھا، اب بھی چلتا ہے۔ انگریزوں کے دور میں رکارڈ کا اور چوری چھپے چلتا تھا۔ پاکستان میں کھلم کھلا چلتا ہے اور اسے جائز سمجھا جاتا ہے۔

لیکن دین کے اس سلسلے میں زمان کے خاندان نے اپنے آپ کو "موشل" بھی بنا رکھا تھا۔ جوان لڑکیاں بے پردہ گھومتی پھرتی تھیں۔ تعلیم نہایت معمولی اداکاری زیادہ تھی۔ اس خاندان کے تمام گھرانے انگریزوں کو ساری دنیا کا بادشاہ سمجھتے تھے اور اُن کی خوشنودی کے لیے ناجائز طریقے بھی فخر سے اختیار کرتے تھے۔ بعد میں جب تحریک پاکستان کی ابتدا ہوئی تو اس خاندان نے مسلمانوں

کا مذاق اڑایا، جنگ عظیم میں انگریزوں کے جنگی فنڈ میں بے دریغ چندہ دیا، مسلمانوں کے اتحاد کو توڑنے کے لیے انگریزوں اور ہندوؤں کا ساتھ دیا، اور اب میں ان کے نام چڑھا رہی ہوں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس خاندان میں بے شمار مسلمان خاندانوں کی مخالفت کے باوجود پاکستان بن گیا تو ان کے خاندان نے پاکستان کو جانے والوں پر قہقہے لگائے مگر ہندوؤں اور سکھوں نے انہیں بھی آنکھیں دکھائیں تو وہ بوریا بستر سمیٹ کر پاکستان آ گئے۔ اب وہ پاکستان کے معزز شہری اور سرکاری ٹھیکیدار ہیں۔ ملک کی سیاست میں ان کا عمل دخل ہے اور سرکاری تقریبات کے مدعو ہیں یہ لوگ شامل ہوتے ہیں۔

یہ اس خاندان کے اثر و رسوخ کا نتیجہ تھا کہ یہ کیس سی۔ آئی۔ اے کے سپرد ہو گیا۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ زمان کے باپ نے انگریز فوجی افسروں سے کہا تھا کہ متعلقہ تھانیدار تفتیش میں کوتاہی کر رہا ہے۔ انگریز افسروں نے اُس کی خوشنودی کی خاطر کیس سی۔ آئی۔ اے کے سپرد کر دیا تھا، ورنہ سب انسپکٹر بنا کر کوتاہی کا مرتکب نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ یہ کیس اتنا اہم بھی نہیں تھا کہ پولیس اور فوج کے انگریز افسر پریشان ہو جاتے اور اس کی تفتیش میں ذاتی مبینہ لیتے۔ اس تھانے میں تو قتل کے کیس بھی زیر تفتیش تھے۔

خواصورت و آوارہ شہزادہ

یہ تو بہت بعد کی باتیں ہیں۔ میں اس خاندان کی بڑی پُرانی واردات

سُنا رہا ہوں۔ زمان کے مُنہ پر تیزاب پھینک کر گناہ مہم بھاگ گیا۔ زمان کچھ دیر چیخ چلا کر گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ گلی کے اگلے موڑ سے ایک ریڑھی (دھڑک) مڑ رہی تھی۔ اسے دو آدمی دھکیل رہے تھے۔ تیزاب پھینکنے والا اندھا دھند دوڑتا جا رہا تھا۔ وہ ریڑھی سے ٹکرایا اور گر پڑا۔ ریڑھی والوں نے کسی کی پیٹھ دیکھا دیکھا تھا۔ انہوں نے اُسے پکڑ لیا۔ وہ آدمی تو مند اور دراز قد تھا۔ ریڑھی والے محنت و مشقت کرنے والے خواجہ فروش تھے۔ اس آدمی کو گرفت میں نہ رکھ سکے۔ وہ آدمی ان کی گرفت سے نکلا اور پھر گر پڑا۔ دونوں ریڑھی والوں نے اُسے پھر پکڑنے کی کوشش کی۔ وہ گتھم گتھا ہوئے لیکن وہ آدمی ان دونوں کو گرا کر نکل گیا۔

اُس زمانے میں لوگ پولیس کی مدد کرتے تھے۔ اُس وقت کسی کو یہ خواہ نہیں ہوتا تھا کہ کسی مجرم کو پولیس کی نشت پناہی حاصل ہے، یا یہ کہ تھانوں اور عدالتوں کے چکر کاٹنے پڑیں گے۔ پولیس مجرموں کی خبر دینے والوں اور گواہوں کا تحفظ کیا کرتی تھی۔ ان ریڑھی والوں نے بھی اپنا فرض ادا کیا تھا لیکن مجرم نکل گیا۔ پھر بھی اُن کی محنت ضائع نہ تھی۔ مجرم کی ایک جوتی گلی میں رہ گئی جو تھانے میں پڑی تھی۔ یہ زری جوتی کا ایک پاؤں تھا۔ ایسی تھے دار جوتی پنجاب میں بنی جاتی تھی۔ دھینگا منشی میں جوتی کا ایک پاؤں وہیں رہ گیا۔

ریڑھی والوں نے ایک اور نشانی یہ بتائی کہ مجرم کی دائیں ٹانگ سے اتنا خون نکل رہا تھا کہ اُس طرف سے شوار لال ہو گئی تھی۔ ان کے خیال کے

مطابق زخم ران پر تھا اور یہ زخم ریڑھی کی ایک اُکھڑی ہوئی لوہے کی موٹی پتھری سے آیا تھا۔ وہ ریڑھی سے اسی جگہ ٹکرایا اور گرا تھا۔ میں نے بعد میں ریڑھی دیکھی۔ اس کی اُکھڑی ہوئی پتھری کا سرا بھی دیکھا۔ اسے ران پر ہی لگنا چاہئے تھا۔ ریڑھی والے نے بتایا کہ اُس آدمی نے سفید شلوار اور فیض پہن رکھی تھی۔ سبر اور منہ پگڑی یا چادر میں ڈھکا ہوا تھا۔

زری جوتی، پگڑی اور شلوار فیض سے یہ ثابت ہو گیا کہ مجرم مسلمان تھا۔ ہندوستان میں آج کل کی طرح ہندو مسلم کشیدگی اُس وقت بھی تھی۔ اکیلے دکیلے مسلمان پر ہندوؤں کے قاتلانہ حملے ہوتے رہتے تھے، لیکن یہ واردات فرقہ وارانہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ایک اس لیے کہ دہلی میں اُن دنوں ہندو مسلم کشیدگی کی کوئی وجہ نہیں تھی اور دوسرے اس لیے کہ وہ محکمہ مسلمانوں کا تھا۔ کسی کے منہ پر تیزاب پھینکنے کی وجہ معلوم کرنے کے لیے پولیس انسپکٹر ہونا ضروری نہیں۔ ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ ایسی واردات کا باعث عداوت ہوتی ہے یا یہ واردات انتقامی طور پر کی جاتی ہے۔ یہ کارروائی رہزنی کی نیت سے نہیں کی جاتی۔ لہذا مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ جس پر تیزاب پھینکا گیا، اُس کی دشمنی کس کے ساتھ تھی۔ دشمنی معلوم کرنے کے لیے متعلقہ فرد کے گھر لو اور ذاتی حالات عادت اور چال چلن معلوم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ دشمنی کا روبرو کے معاملے میں بھی ہوسکتی ہے اور جائیداد کے سلسلے میں بھی۔ رقابت بھی ایک عام وجہ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کوئی وجہ ہوسکتی ہے۔ سب انسپکٹر کہہ سکتے ہیں جو تفتیش کی تھی (اور جو اُسے کسی نتیجے پر نہیں پہنچا سکی تھی) اس کے مطابق زمان کا کوئی دشمن نہیں تھا۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، یہ کیس انڈور سوخ کے تحت سی۔ آئی۔ اے کو دیا گیا تھا۔ علاقے کے تھانیدار، کبیر ناتھ پر بلا جواز کوتاہی کا شک کیا گیا۔ وہ تفتیش کر رہا تھا تو زمان کا باپ اور بچے ماں سے اُسے پریشان کرتے رہتے تھے کہ وہ کچھ نہیں کرے گا۔ اس سے اُس کی حوصلہ شکنی ہوئی۔ بہر حال میں نے اُس کے بالائی افسروں کے دلوں سے اُس کے خلاف شک نکال دیا تھا۔ کبیر ناتھ نے زمان (مظلوم) کے متعلق مجھے بتایا کہ خوبصورت جوان ہے اور چال چلن کا بہت بُرا۔ اسے آوارہ شہزادہ کہہ لیں۔ دولت مند مال باپ کا اکھوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے وہ بُری طرح بگڑا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ اُس کی آوارگی کا باعث صرف لاڈ اور پیار نہیں، دولت تھی۔ مجھے تفتیش اپنے انداز میں شروع کرنی تھی۔

مستورات بھی شامل ہیں

میں جب واپس گیا تو زمان کا باپ، چچا اور ماموں مجھے بلے۔ اُن کے ملنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ مجھے اپنا ملازم سمجھ رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے اس قسم کے حکم سنائے شروع کر دیے کہ زیادہ سے زیادہ تین دن تک ملازم ہمارے سامنے آجائے۔ ہم زیادہ انتظار نہیں کریں گے۔ پولیس کپتان سے کہہ کر ہم دو اور انسپکٹر بلا لیں گے۔

میں خاموشی سے سنا دیا۔ زمان کے باپ نے جب یہ کہا کہ آپ نے ملازم کو کھڑا کیا تو ہم آپ کو انعام دیں گے تو میری برداشت کی حد ختم ہو گئی۔

میں نے غصے کو دبا کر اور ہونٹوں پر مصنوعی مسکراہٹ لاکر اور فذوی کمترین کا مرام اسالہج اختیار کر کے کہا کہ میں حضور کا خادم ہوں۔ حضور صرف یہ خیال رکھیں کہ میں فرشتہ نہیں ہوں اور میں جن جھوٹ اور جادوگر بھی نہیں ہوں۔ گناہگار سا انسان ہوں۔ عزم کو کچلنے کا پوری کوشش کروں گا لیکن تین دنوں کا وعدہ نہیں کروں گا۔

”ہمارا مطلب یہ ہے کہ نفیش میں مستی نہ ہو۔“ زمان کے باپ نے کہا۔ ”پولیس کپتان ہمارا یار رہیں۔ ہم اشارہ کریں تو....“

”جناب عالی! میں نے اُسے تو“ سے آگے بولنے نہ دیا اور کہا۔ ”میں آپ کو یہ بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ پولیس کپتان انگریز ہے اور انگریز کسی ہندوستانی کنڈیکٹر کے یار رہی نہیں ہوتے۔ میں آپ کو کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ میری بات غور سے سن لیں۔ نفیش کے دوران مجھے آپ کے گھر کے افراد سے بھی کچھ پوچھنا پڑے گا۔ ان افراد میں مستورات بھی شامل ہیں۔ اگر آپ نے تعاون نہ کیا تو میں پولیس کپتان کو اطلاع دے کر نفیش اذھوری چھوڑ جاؤں گا۔ مجھے جس وقت ضرورت محسوس ہوگی آپ کے گھر جاؤں گا۔ آپ کے کسی بھی فرد کو تھانے بلاؤں گا۔“

”لیکن یہ خیال رکھنا کہ ہم عزت دار لوگ ہیں۔“ زمان کے ماموں نے کہا۔ ”ہمارے گھروں میں تھانیداروں کی طرح نہ آنا۔“

”میری نظر میں آپ سب مشتبہ ہیں۔“ میں نے لہجے کی نرمی ختم کر کے تھانیداروں کے رعب سے کہا۔ ”آپ لوگ تشریف لے جائیں اور مجھے اپنا

کام کرنے دیں۔“

وہ مجھے گھورتے ہوئے چلے گئے۔ کبیر ناٹھ نے مجھے بتایا کہ اُسے بھی وہ پولیس کپتان کا رعب دیتے رہتے تھے۔

میں نے ریڑھی والوں کو بلوایا اور جائے واردات پر چلا گیا۔ یہ قدیم دلی کی قدرے کشادہ گلی تھی۔ ایک وہ موڑ تھا جو زمان مڑا تو اُس پر تیزاب پھینکا گیا اور چھ سات گھر آگے وہ موڑ تھا جہاں تیزاب پھینکنے والا ریڑھی سے ٹکرایا تھا۔ اس گلی میں متوسط اور اس سے نیچے طبقے کے لوگ رہتے تھے۔ میں نے کبیر ناٹھ سے پوچھا کہ زمان کا گھر کہاں ہے۔ اُس نے بتایا کہ میاں سے دو اڑھائی میل دُور ہے اور وہ علاقہ امیروں کی حویلیوں کا علاقہ ہے۔ اُس زمانے میں کوٹھیلوں کا اتنا رواج نہیں تھا جتنا آج ہے۔ وہ عمارت جیسی حویلیوں اور چوڑوں کا زمانہ تھا۔

میں نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ زمان جیسا شہزادہ رات ساڑھے دس بجے ان گلیوں سے کیوں گزر رہا تھا۔ میں دلی سے اچھی طرح واقف تھا۔ اگر زمان نے اپنے گھر کو جاتے ان گلیوں کا راستہ چھوٹا سمجھا تھا تو یہ میرے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ یہ اُس کا راستہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اُسے پیدل جانے کی کیا سوجھی تھی؟ وہ تانگے پر کیوں نہ گیا؟ اگر وہ اتنی دولت مند کا بیٹا تھا تو ان گلیوں میں اُس کا کوئی دوست نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ غریبوں کا محلہ تھا۔ بہر حال اس سوال کا جواب مجھے زمان سے لینا تھا۔

ہندو لڑکی کی دوستی

میں جب ایک سب انسپکٹر اور دو تین کانسیبلوں کے ساتھ گلی کا جائزہ لے رہا تھا تو گلی میں رہنے والے ایک اکٹھے ہو گئے۔ میں نے ان میں سے چند ایک سے پوچھا کہ جس آدمی کے منہ پر تیزاب پھینکا گیا تھا اُسے وہ جانتے تھے؟ یا اُسے کسی نے پہلے کبھی اس گلی سے گزرتے دیکھا تھا؟۔ ان میں سے کوئی بھی زمان کو نہیں جانتا تھا۔ میں نے انہیں زمان کا تاپہ بتایا تو بھی وہ اُسے نہ پہچان سکے۔ میرے دماغ میں یہ خیال آیا تھا کہ زمان جیسے آدھ امیر زادے لوگوں کی ہوسٹیل کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے زمان کی نظر کسی لڑکی پر ہو اور وہ اُس کے پیچھے اس گلی میں آتا ہو۔

جو لوگ متاثرہ دیکھنے جمع ہو گئے تھے، ان میں سے پانچ چھ نے بتایا کہ واردات کی رات انہوں نے کسی کی چیخ و پکار سنی تو وہ باہر نکل آئے۔ گلی میں روشنی بہت مدھم تھی۔ صرف ایک بلب جل رہا تھا جو اگلے موڑ پر تھا۔ یہ وہ موڑ تھا جہاں ریڑھی آ رہی تھی۔ محنتے والوں نے دیکھا کہ ریڑھی کے قریب تین آدمی گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ محنتے والے ادھر کو دوڑے مگر لڑائی ختم ہو گئی اور ایک آدمی بھاگ گیا۔ اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ ایک آدمی دوسرے موڑ پر پڑا ہے۔ ایک دولا لٹنیں اور ایک دوڑا جیں آ گئیں۔ اس بے ہوش آدمی کا چہرہ بخود رہا تھا۔ کھال رنگ بدل رہی تھی کسی نے لکنا کہ اس کے منہ پر تیزاب پھینکا گیا

ہے۔ کوئی بھی اسے نہ پہچان سکا۔ کسی نے کہا پولیس کو اطلاع دو کسی نے کہا ہسپتال لے چلو اور کسی نے کہا پولیس کو ہمیں بلاؤ۔ آخر یہ فیصلہ ہوا کہ اسے ریڑھی پر ڈالو اور تھکانے لے چلو۔ چنانچہ زمان کو ریڑھی پر ڈالا گیا۔ ریڑھی والوں نے بخوشی لکنا کہ وہ اسے تھکانے لے جائیں گے۔ محنتے کا ایک پڑھا لکھا آدمی ان کے ساتھ ہو گیا۔ سب کچھ لکنا تھا نے اپنی کاغذی کارروائی کی اور زمان کو ہسپتال بھیج دیا۔ اُس نے ریڑھی والے دونوں آدمیوں کو اور ان کے ساتھ جانے والے کو گواہ کے طور پر شامل تفتیش کر لیا۔ ڈاکٹر نے رپورٹ لکھی کہ بڑا تیز تیزاب پھینکا گیا ہے جس سے انکھیں ختم ہو چکی ہیں۔ زمان پندرہ دنوں سے ہسپتال میں پڑا تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ دوسرے دن ہوش میں آ گیا تھا۔ کبیر ناتھ نے اُس سے پوچھا تھا کہ اُسے کس پر شک ہے۔ اُس نے کسی پر بھی شک کا اظہار نہیں کیا تھا۔

میں ہسپتال زمان کے پاس چلا گیا۔ اُسے دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ اُس کا سر اور چہرہ پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ آنکھیں بھی پٹیوں میں چھپی ہوئی تھیں۔ سانس لینے کے لیے ناک دواسی ننگی اور کھانے پینے کے لیے ہارٹ پیوں سے باہر تھے۔ ہارٹ بھی جلے ہوئے تھے۔ ان کا گوشت کچھا ہوا اور گھڑا ہوا تھا۔ ایک کان پٹیوں میں تھا۔ دوسرا ننگا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ بڑا خوبصورت جوان تھا۔ اس کے آنکھوں اور بازوؤں کے رنگ سے پتہ چلتا تھا کہ خوبصورت تھا مگر اب میں تصویر میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا چہرہ کس قدر بھیاں ہو گیا ہوگا۔ میں نے اپنے آپ سے لکنا تھا کہ اُسے جانے کون سے گناہ کی سزا دی ہے۔

اُس کے پاس جو تیار دار بیٹھے تھے، انہیں میں نے باہر نکال دیا۔
 کبیر ناٹھ نے اُسے بتایا کہ میں کون ہوں۔ وہ صدمی آواز میں بول سکتا تھا۔ میں نے
 اُس کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا اور اس کا اتنا خوبصورت چہرہ لگاڑ دینے والے
 کو بڑا مہلا کہا اور یہ بھی کہا کہ اُس شخص کو پچاسی کے تختے پر کھرا کر کے دم لوں گا۔
 میری ہمدردی کا یہ اثر ہوا کہ وہ ہمکیاں لینے لگا۔ وہ کچھ دیر روتا رہا۔ اُس کے
 دل پر پوری طرح قبضہ کر کے میں نے دوستانہ لہجے میں پُچھ کر شروع کر دی۔
 وہ کسی پر بھی شک کا اظہار نہیں کر رہا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ کسی پر اُسے ذرا
 سنبھلی شک ہے تو اُس کا نام بتا دے، مگر اُس نے کسی کا بھی نام نہ لیا۔

”دیکھو زمان!“ میں نے کہا۔ ”مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ، ورنہ میں مجرم
 کو نہیں پکڑ سکوں گا۔ تم مجھے جو کچھ بتاؤ گے وہ کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ مجھے بتاؤ کہ
 شادی سے پہلے یا اب بھی تنہا کسی لڑکی کے ساتھ محبت ہوگی اور تمہارا
 کوئی رقیب ہوگا۔“

اُس نے انکار میں سر ہلایا۔

”تم اتنے خوبصورت جوان ہو۔ میں نے اُسے ہوا دینے کے لیے
 کہا۔ ”تم پر لڑکیاں مرقی ہوں گی۔“

اُس نے پھر انکار میں ہی سر ہلادیا۔

”تم اُس گلی میں کیا کرنے گئے تھے؟“

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ میں نے اپنا سوال دہرایا تو اُس نے کہا۔

”ایک دوست کے گھر گیا تھا۔“

”اُس کا نام؟“ میں نے پوچھا۔ ”کہاں رہتا ہے؟“
 ”وہ بڑا اچھا دوست ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”اُس سے کچھ پوچھنے کی
 ضرورت نہیں۔“

”میں اُس سے بہت کچھ پوچھنے کی بڑی شدید ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔“
 اُس نے اس دوست کا نام نہ ہی بتایا۔ میں نے بہت جھک جھک کی
 مگر وہ ٹالتا رہا۔ سب انسپکٹر کبیر ناٹھ نے مجھے اشارہ کیا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔
 یہ کسی دوست کے ہاں نہیں گیا تھا۔

”اُس گلی میں سے پہلے بھی کبھی گزرے ہو؟“

”پہلی بار گزرا تھا۔“ اُس نے جواب دیا۔

”اس سے پہلے تم جہاں کہیں بھی گئے تھے، وہاں کسی سے لڑائی جھگڑا
 ہوا تھا؟“
 ”نہیں۔“

”زمان! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے تمہارے
 ذاتی حالات کے ساتھ کوئی ذاتی دلچسپی نہیں۔ مجھے صرف یہ معلوم کرنا ہے
 کہ کسی نہ کسی کے دل میں تمہاری دشمنی ہے۔ تم نے کسی کو کسی وجہ سے پریشان
 کیا ہوگا، کسی کا دل توڑا ہوگا، کسی کی بہو بیٹی پر دست درازی کی ہوگی۔ اُس نے
 تم سے انتقام لیا ہے۔ تم ذرا سا اشارہ دے دو۔ اُس آدمی کو پکڑنا میرا کام ہے۔“
 اُس نے جواب دینے سے ہی انکار کر دیا۔ میں نے اپنے انداز سے پوچھ کر
 شروع کر دی۔ وہ جس طرح جواب دے رہا تھا اس سے مجھے شک ہو رہا تھا کہ

صحیح جواب دینے سے بچ رہا ہے۔ ایک بار اُس نے یہ بھی کہا کہ اُسے جواب دیتے تکلیف ہوتی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ لیٹ جائے اور آرام آرام سے بولے۔ میں اُس کے پیچھے پڑا رہا۔

”تمہارے دوستوں کی تشویش میں زری جوتی کون پہنتا ہے؟“
”ہمارے خاندان کے پانچ چھ آدمی زری جوتی پہنتے ہیں۔“ اُس نے

جواب دیا۔

مشکل یہ تھی کہ وہ جوتی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے جوتی کا حلیہ بیان کیا تو اُس نے اگتائے ہوئے لہجے میں کہا کہ جوتی کے ایک پاؤں سے وہ کسی آدمی کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔ میں نے اُسے بتایا کہ اُس پر تیزاب پھینکنے والے نے سفید شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ اُس نے کچھ دیر خاموش رہ کر کہا کہ اس سے بھی وہ کسی کا نام نہیں لے سکتا۔

وہ اوٹ پٹانگ اور ٹال مٹول کے انداز سے جواب دے رہا تھا۔ میں جھنجھلا اٹھا۔ میں نے کہا۔ ”زمان! مجھے تمہارے ساتھ دلی ہمدردی ہے لیکن میں تمہیں صاف بتاتا ہوں کہ تم شریف آدمی نہیں ہو۔ تمہارے چال چلن کے متعلق مجھے پوری رپورٹ مل چکی ہے۔ تم مرو یا جیو، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے اپنا فرض ادا کرنا ہے اور میں فرض ادا کر کے رہوں گا۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ مجھ سے جو کچھ چھپا رہے ہو وہ میں جانتا ہوں۔ میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔“ میں نے ہر ایم تیرے حوالے کیا۔ ”اس محلے میں تمہاری آشنائی جس عورت کے ساتھ ہے اُس کے کسی بھائی یا باپ نے یا اُس کے کسی اور چاہنے والے

نے تم پر تیزاب پھینکا ہے۔“

اُس کے مُنہ سے نکل گیا۔ ”ہندوؤں میں اتنی جرات نہیں ہو سکتی۔“
”تو اُس رات تم اُس سے ملنے گئے ہو گے۔“

”نہیں۔“ اُس نے کہا۔ ”اُس رات میں کہیں اور سے آ رہا تھا۔“
بات اُس کے مُنہ سے نکل گئی تھی۔ اُسے اُس نے نکلنے کی کوشش نہ کی۔ میری حوصلہ افزائی سے اُس نے بتا دیا کہ واردات والی گلی سے تھوڑی ہی دُور ایک ہندو لڑکی کے ساتھ اُس کی دوستی ہے۔ یہ لڑکی شادی کے پانچویں مہینے بڑھ چکی تھی۔ اُس کی عمر ابھی بیس سال بھی نہیں ہوئی تھی۔ ہندوؤں کے ہاں بیوہ کو دوسری شادی کے حق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اس غیر انسانی ظلم سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں ان کی ایک مثال یہ تھی۔ زمان اُسے اُس کے گھر کے قریب ایک غیر آباد مکان میں جو کسی حد تک کھنڈر بن چکا تھا، ملا کر رہا تھا۔
”اس لڑکی کی دوستی کسی اور کے ساتھ بھی ہوگی۔“ میں نے کہا۔

”نہیں۔“

”میں مان نہیں سکتا۔“ میں نے کہا۔ ”اور میں سمجھ نہیں سکتا کہ تم چُپا کیوں رہے ہو۔“

”پھر مجھے معلوم نہیں۔“

”کیا اپنی شادی کے بعد بھی تم نے اس لڑکی سے دوستی جاری رکھی؟“
”ہاں جی۔“

یہاں سے مجھے یہ خیال آیا کہ اس ہندو لڑکی کی دوستی کسی اور کے ساتھ

بھی ہوگی یا کوئی اور اس لڑکی کے ساتھ دوستی کرنا چاہتا ہوگا اور اُس نے زمان کو نکاٹ سمجھا ہوگا مگر زمان کہہ رہا تھا کہ اُسے معلوم نہیں۔ یہ اب مجھے معلوم کرنا تھا۔ میں نے زمان سے کہا کہ میں اُس کے پاس پھر آؤں گا اور وہ مجھے وہ باتیں بھی بتا دے جو وہ مجھ سے چھپاتا ہے۔

بداخلاقی کی سببیتوں کے کھڑے مکوڑے

میں جب زمان کے باپ سے ملنے اُس کے گھر گیا تو زمان کا چچا اور ماموں بھی آگئے۔ حویلی محل جیسی تھی۔ میں نے پہلے ان تینوں کے ساتھ بات کی اور انہیں بتایا کہ یہ واردات انتقامی ہے۔ زمان نے کسی کو پریشان کیا ہوگا یا کسی کی ہونٹوں سے دست دراز کی ہوگی یا آپ میں سے کسی نے کسی کے ساتھ کوئی ناقابل برداشت زیادتی کی ہوگی۔ کسی کی بے عزتی کی ہوگی۔

تینوں بیک وقت بول پڑے۔ ”نہی نہ“۔ پھر زمان کے ماموں نے تقریر شروع کر دی جس میں اُس نے مجھے یہ بتایا کہ وہ بہت شریف لوگ ہیں۔ بڑے سخی ہیں۔ وقتاً فوقتاً غریبوں کو اکٹھا کر کے انہیں کھانا کھلاتے ہیں اسی لیے انگریز افسر اس خاندان کی عزت کرتے ہیں۔

”زمان کا چال چلن کیسا ہے؟“

”وہ تو بھولا بادشاہ ہے جی!“ اُس کے باپ نے جواب دیا۔ ”میں پرہیزگار ہوں۔ اُس پر تیزاب کس نے پھینکا ہے تو آپ بھی دیکھ لیں، اُس کی

لاش نہیں ملے گی۔“

”لیکن جس طرح آپ باتیں کر رہے ہیں اس طرح تو کبھی بھی پرہیزگار نہیں چلے گا کہ وہ کون ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ کسی دشمن کا ہتھکڑیا یہ تو مجھے آپ ہی بتا سکتے ہیں کہ آپ لوگوں کا یا زمان کا دشمن کون ہے۔ دشمنی کا رد باری بھی ہو سکتی ہے۔ جائیداد کے تنازعے پر بھی ہو سکتی ہے۔“

وہ تینوں میری بات سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کر رہے تھے۔ میں نے زمان کے چچا اور ماموں کو دہاں سے اٹھادیا۔ میں زمان کے باپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔

”جب تک آپ میرے ساتھ تعاون نہیں کریں گے میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”اب آپ میرے ساتھ اکیلے ہیں۔ مجھے درپردہ بتا دیں۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ میں آپ کو یقین سے بتاتا ہوں کہ آپ کے بیٹے کا چال چلن بہت بُرا ہے۔ مجھے یہ بتائیں کہ اس سلسلے میں اس کی دشمنی کس کے ساتھ تھی۔“

اُس نے پھر بھی زمان کی تعریفیں کیں۔ میں ان لوگوں کے دشمنوں کا کھوج لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ زمان کی شادی کو صرف چھ مہینے گزرے ہیں۔ ہو سکتا ہے اس رشتے کے سلسلے میں عداوت پیدا ہوگئی ہو۔ میں نے زمان کے باپ سے پوچھا کہ زمان کی بیوی کے ایک دوادر امیدوار بھی ہوں گے۔ مجھے بتائیں کہ یہ رشتہ کس طرح طے ہوا تھا۔

”جس طرح رشتے طے ہوتے ہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میرے

بیٹے کو تو دس لڑکیوں کے رشتے مل رہے تھے۔“

اُس نے مجھے پریشان کر دیا۔ مجھے اپنے آپ پر ہمیشہ قابو رہتا تھا لیکن اس شخص نے میرا عقد میرے قابو سے نکال دیا۔ میں نے عقد سے کانپتی ہوئی اور دھیمی سی آواز میں کہا: ”دولت اور ٹھیکیداری اور انگریزوں کی چابوڑی مل کر بھی تم لوگوں کے گناہوں کو لوگوں کی نظروں سے نہیں چھپا سکتیں۔ تم تصور میں اپنے آپ کو اتنا اُدب چلے گئے ہو کہ تمہیں خدا بھی یاد نہیں رہا۔ تم بد اخلاقی کے پستبیلوں میں ریگنے والے کیڑے مکوڑے ہو۔ میں پولیس انسپکٹر ہوں۔ تمہارے خاندان کے متعلق کچھ معلوم کر کے یہاں آیا ہوں۔ تمہارے کہنے سے میں تمہیں اور تمہارے بیٹے کو شریف اور پارسانہیں کہہ سکتا۔“

”ایک تو ہمارے لڑکے کی زندگی تباہ ہو گئی ہے دوسرے آپ ہماری بے عزتی کر رہے ہیں۔“ اُس نے غصیلی آواز میں کہا۔ ”آپ گفتیش کریں، ہمیں لازم نہ سمجھیں۔“

”مجھے آپ کے لڑکے کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں“ میں نے کہا۔ ”میں اُس قانون کا محافظ ہوں جو اس ملک میں چل رہا ہے۔ اس قانون پر زبردستی ہے۔ مجھے اُس مجرم کو پکڑنا ہے جس نے اس قانون کی توہین کی ہے اور اُسے زیادہ سے زیادہ سزا دلانی ہے تاکہ کل کوئی اور آدمی کسی اور آدمی کے منہ پر تیزاب پھینکنے کی جرأت نہ کرے، مگر آپ میری کوئی مدد نہیں کر رہے۔ ذرا چوتھرے سے اُتریں اور میرے ساتھ کھل کر بات کریں۔ آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں میں آپ کو ملزم میں شائبہ سمجھ رہا ہوں۔ آپ کی یا آپ کے بیٹے کی کسی ناقابلِ برداشت حرکت کی وجہ سے

یہ جرم سرزد ہوا ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کروں گا۔ مجھے یہ بتا دیں کہ آپ کے یا آپ کے بیٹے کے ہاتھوں ستایا ہوا وہ کون تھا جس نے اس ظالمانہ طریقے سے انتقام لیا ہے۔“

اُس کی جھاک تو بیٹھ گئی لیکن معاملہ حل ہوئی رستی کا تھا جہل کر بھی بل نہ گیا۔ اُس نے یہاں تک تسلیم کر لیا کہ زمان کی عادتیں اچھی نہیں تھیں۔ ہو سکتا ہے اُس نے باہر کوئی حرکت کی ہو۔ اس سے زیادہ مجھے اس سے کچھ بھی حاصل نہ ہوا۔

قرض کے بدلے بیٹی دے دی

میں یہ دیکھ چکا تھا کہ یہ اوجھے لوگ میں اور دولت نے ان کے ذہنوں کو رنگ لگا رکھا ہے۔ اتنی زیادہ باتوں سے اور پوچھ گچھ سے میں یقین کی حد تک محسوس کرنے لگا تھا کہ جو کچھ ہے ان پانچ چھ گھروں میں ہے۔ میں نے دماغ پر زور دیا تو میں نے زمان کی بیوی سے پوچھ گچھ کی ضرورت محسوس کی۔ بہت سوچا اور یہ فیصلہ کیا کہ زمان کے کسے سے بات کی جائے۔ آپ جانتے ہیں کہ لڑکی اور لڑکے کے کسرال میں عموماً جھگڑا ہوتا ہے اور اکثر رشتے پیار اور محبت کے زیر اثر نہیں رہتے جاتے۔ ان کے پیچھے خاندانی سیاست ہوتی ہے۔ ان میں سے کسی کو بھیڑ دو تو وہ ایک دوسرے کو ننگا کر دیتے ہیں۔ انہی ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا کر بھی بھید لیے جاسکتے ہیں۔ میرے دماغ پر اس واقعہ کا یہ پہلو بھی سوار تھا کہ زمان کا چال چلن ٹھیک نہیں تھا اس لیے اُس کی

بیوی اس سے نالاں ہوگی اور سسر بھی شاید ناراض ہو۔

میں زمان کے سسر کے ہاں چلا گیا۔ اُس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ اُس نے بھی اپنا سُر ذرا اونچا رکھنے کی کوشش کی لیکن اُس کی پریشانی صاف ظاہر تھی۔ اُس کی باتوں میں جھجک تھی۔ وہ زمان کے باپ سے مختلف تھا میں نے اُس کی اس کیفیت سے فائدہ اٹھایا اور اس کے مطابق باتیں کر کے اُس کے دماغ پر قبضہ کر لیا۔ اُس سے پوچھا کہ اُسے کسی پر شک ہے؟ وہ جھجک گیا۔ ”آپ کھل کر بات کریں“ میں نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ زمان اچھے چلن کا آدمی نہیں۔ اُس سے کسی نے انتقام لیا ہے۔ مجھے افسوس اس بات پر آ رہا ہے کہ یہ چوٹ آپ کی بیٹی پر پڑی ہے۔“

”سیری بیٹی پہلے ہی کبھی نہیں تھی“۔ یہ زخم خوردہ باپ تھا۔ پھٹ پڑا۔ میں نے ہمدردی سے اُس کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ اُس نے کہا ”میں تو یہاں رشتہ دے ہی نہیں رہا تھا مگر دینا پڑا۔“

”کیا مجبوری تھی؟“

”میں مقروض تھا“ اُس نے کہا اور اُس کے آنسو نکل آئے۔

اُس کے سینے میں غبار بھرا ہوا تھا جسے وہ نکالنا چاہتا تھا۔ میں نے غبار نکالنے میں اُس کی مدد کی۔ اپنی اُستادی چلائی اور وہ کھل کر بونے لگا۔ بات تو اُس نے بڑی لمبی سنائی تھی لیکن میں مختصر کر کے سناتا ہوں۔ لڑکی (زمان کی پرکی) کے والدین اس کا رشتہ ایک ادھر میں دینا چاہتے تھے۔ لڑکے والے کہتے تھے کہ شادی جلدی ہونی چاہئے لیکن لڑکی والے مقروض تھے۔ وہ ایک سال کی

مانگ رہے تھے۔ اس لڑکے کے بعد ایک اور لڑکا تھا۔ اس کے والدین بھی جلدی شادی کی کہہ رہے تھے۔

تیسرا امیدوار زمان تھا۔ اُس کے سسر نے مجھے صاف الفاظ میں بتایا کہ اُس کی بیٹی زمان کو پسند نہیں کرتی تھی۔ حالانکہ ان تمام گھرانوں کے مردوں میں زمان سب سے زیادہ خوب روکھ خوبصورت تھا اور زمان کا گھرانہ سب سے زیادہ مالدار تھا۔ لڑکی نے اپنی ماں سے کہا تھا کہ اُسے زمان اچھا نہیں لگتا۔ لڑکی کے باپ نے مجھے بتایا کہ زمان میں اوجھلایا ہے۔ دوسری خرابی یہ کہ اکھوتا ہونے کی وجہ سے ماں باپ نے اُسے شہزادہ بنا رکھا تھا۔ لڑکی کی ناپسندیدگی کی ایک اور وجہ یہ معلوم ہوئی کہ زمان نے اس لڑکی پر کبھی ڈوبے ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ لڑکی خود سر اور کسر کش تھی۔ خوبصورت بھی تھی اور مقروض ہونے کے باوجود اپنے آپ کو امیر ماں باپ کی بیٹی سمجھتی تھی۔ یہ لوگ کاروبار کے سلسلے میں مقروض ہوئے تھے۔ ان کا رہن سہن امیرانہ تھا۔ لڑکی نے زمان کو دھتکار دیا تھا۔

اب لڑکی کے رشتے کی بات چلی تو زمان کے کہنے پر اُس کے باپ نے لڑکی کے باپ سے بات کی۔ لڑکی کے باپ نے صاف انکار کر دیا۔ زمان کے والدین کو پتہ چل گیا کہ لڑکی والے مقروض ہونے کی وجہ سے شادی جلدی نہیں کر سکتے اس لیے دونوں لڑکوں والوں نے رشتہ لینے سے انکار کر دیا ہے۔ ادھر زمان ضد کر رہا تھا کہ وہ اسی لڑکی کے ساتھ شادی کرے گا۔ اس کے باپ نے لڑکی کے باپ کو یہ پیش کش کی کہ وہ اُس کا سارا قرض ادا کر دے گا اور واپس صرف آدھا لے گا اور وہ بھی بڑی آسان قسطوں میں۔ لڑکی کا باپ منطقی میں شرمسار

ہو رہا تھا اور مقابلے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اُس کی لڑکی کا شتر
ٹھکرا دیا گیا تھا۔ چنانچہ اُس نے زمان کے باپ کی پیش کش قبول کر لی اور اُس
سے قرض سے زیادہ رقم لے لی اور اپنی بیٹی کو روتا ڈولی میں بٹھا دیا۔

لڑکی سرکش اور خود سر بھی

زمان کو یہ لڑکی پسند تھی لیکن اس پسند میں محبت والی کوئی بات نہیں تھی۔
زمان اُسے صرف خوبصورت لڑکی سمجھتا تھا۔ لڑکی کے باپ نے بتایا کہ لڑکی
جب پہلی ہی بار اپنے گھر آئی تو باپ کو یہ تلخ احساس پیدا ہو گیا کہ اُس نے
لاچ میں آکر اپنی بیٹی بڑے ہی غلط گھر میں ایک غلط آدمی کو دے دی ہے۔ زمان
نے پہلی ہی ملاقات میں لڑکی سے کہا کہ میں نے تمہیں خریدا ہے۔ مختصر یہ کہ زمان نے
اوچھے پن کے منظر ہرے شروع کر دیے۔ اس کے بعد جوچھ مہینے گزرے وہ اس
لڑکی کے لیے بڑا ہی تکلیف دہ عرصہ تھا۔ اُس کے باپ نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ
اُس کی بیٹی اُس لڑکے کو چاہتی تھی جس کے ساتھ اُس کا رشتہ طے ہو گیا تھا۔ زمان
کو تو وہ پسند کرتی ہی نہیں تھی۔

لڑکی سرکش اور خود سر تھی۔ اُس نے زمان سے دیکھنے کی بجائے اُسے
ٹرک پر شرمی جواب دینے شروع کر دیے۔ وہ اپنی ماں کو بتاتی رہتی تھی کہ زمان
کے ساتھ اُس کی زندگی کس طرح گزر رہی ہے اور اُس کے ساتھ کیا باتیں ہوتی
ہیں۔ زمان اُسے کہتا تھا کہ وہ برادری میں سب سے زیادہ خوبصورت نوجوان ہے

اور بے شمار لڑکیاں اُس پر مرقی ہیں اور اُس کی محبت کا دم بھرتی ہیں۔ وہ ایک
ہندو لڑکی کا نام بار بار لیتا اور کہتا تھا کہ اُس کے مقابلے میں وہ (اُس کی بیوی)
کچھ بھی نہیں۔

زمان کی بیوی نے تنگ آکر اُسے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ اُسے ہلکے
پسند نہیں کرتی تھی۔ یہ فیصلہ اُس کے باپ کا تھا کہ اُسے زمان کے ساتھ بیاہ
دیا گیا۔ زمان نے منہس کر کہا۔ ”تمہاری پسند اور نا پسند کی کسے پروا ہے۔ میں نے
تمہیں خریدا ہے۔ نقد ادا کیا ہے۔ تم میری بیوی نہیں لوٹو گی ہو۔ زرخید غلام ہو۔
میں تمہیں قیدی بنا کر رکھوں گا۔“

دونوں کے درمیان نفرت بڑھ گئی۔ زمان اپنی خوبصورتی اور دولت کا ذکر
تکبر کے لہجے میں کرتا تھا۔ اُس نے اپنی بیوی کو قیدی بنالیا اور میاں بیوی کے
تعلقات توڑ دیے۔ بیوی کو وہ اُس کے ماں باپ کے ہاں جانے سے نہیں روکتا
تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اُس کے سلوک سے بیوی پریشان ہو جائے گی اور سر اُس
کے قدموں میں رکھ دے گی لیکن بیوی کو جیسے اُس کی پردا ہی نہیں تھی۔ زمان کی
کوشش یہ تھی کہ بیوی اُس کے آگے بولے اور وہ اُسے دق کرتا رہے۔

ایک روز اُس نے اپنی بیوی پر خوبصورتی کا رعب گانٹھا شروع کر دیا۔
بیوی نے اُسے آخر کہہ ہی دیا۔ ”میں نے اپنی ماں کو بتا دیا تھا کہ مجھے زمان بالکل
پسند نہیں آتا اگر اُس کے ساتھ میری شادی ہو گئی تو بھی میں اُسے دل سے اپنا
خاندان تسلیم نہیں کروں گی۔“

”تمہیں جو بار پسند ہے اُس کا نام لے کر دیکھو۔“ زمان نے کہا۔ اُسے

ایسے طریقے سے قتل کر دیں گا کہ نہ لاش ملے گی نہ قاتل کا سراغ... میں نے تمہیں کب پسند کیا تھا۔ تمہیں خوبصورت کون کتنا ہے۔ خوبصورت میں ہوں اور خوبصورت وہ ہندو لڑکی ہے جسے میں اشارہ کر رہا ہوں تو وہ اپنے خون سے میرے پاؤں دھو ڈالے۔

میں نے لڑکی کے باپ سے پوچھا کہ اُن کے درمیان یہ باتیں کب ہوئی تھیں۔ اُس نے بتایا کہ تیرا بپھینکنے والی واردات سے کوئی ایک مہینہ پہلے۔ لڑکی نے اپنے باپ کو بتایا تو باپ نے زمان کے ساتھ بات کی۔ ناک نے اُس کی بھی بے عزتی کر دی۔ باپ نے اپنی بیٹی کو بتایا تو بیٹی نے اُسے کہا کہ وہ آئندہ زمان کے ساتھ کوئی بات نہ کرے۔

”اس سے ایک مہینہ بعد خدا نے زمان کو یہ سزا دی۔“ لڑکی کے باپ نے کہا۔ ”اگر وہ مر جاتا تو مجھے خوشی ہوتی۔ اُس کا صرف چہرہ بگڑا ہے۔ میری بیٹی پہلے ہی اس سے نفرت کرتی تھی۔“

کھانے میں زہر دے سکتی تھی

یہ چار دیواری کی دنیا کی کہانی تھی۔ یہ میاں بیوی کی حقیقت تھی۔ میاں اوجھا تھا اور بیوی اُس سے نفرت کرتی تھی۔ مجھے زمان کے سسر سے یہ ساری داستان سُنی پڑی کیونکہ میں نے خود اُسے بولنے پر اکسایا تھا۔ اب میں سوچنے لگا کہ اتنی طویل داستان سے (جو میں نے اختصار سے سنائی ہے) مجھے کچھ حاصل ہو سکتا ہے؟ میں تو یہ معلوم کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا کہ زمان

کا ایسا دشمن کون تھا جس نے اُس پر ایسا بھیجا کہ وار کیا۔ اس کہانی میں جو زمان کے سسر نے سنائی، صرف زمان کی بیوی تھی جس کے دل میں زمان نے دشمنی اور نفرت کا بیج بویا تھا۔ میں اس سوال پر غور کرنے لگا کہ بیوی زمان پر ایسا وار کر سکتی ہے؟ ایک ہی صورت ہے کہ اُس نے کسی کرائے کے آدمی سے یہ کام کرایا ہے۔ لڑکی کے متعلق بتایا گیا تھا کہ سسر کش اور خود سسر ہے۔

نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ لڑکی ایسا کام نہیں کر سکتی۔ اگر کراچی تو زمان کو قتل کر دیتی۔ اُسے کھانے میں زہر بھی دے سکتی تھی۔ تاہم میں نے اس لڑکی سے بھی ملنا ضروری سمجھا لیکن فوراً نہیں۔ میری توجہ اُس ہندو نوجوان بیوہ پر مرکوز ہو گئی جسے زمان نے دوست بنا رکھا تھا۔ وہاں مجھے رقابت کا شک تھا۔ میں نے شام کے بعد اس ہندو لڑکی کو کھانے بلایا۔ مجھے اُس کا نام یاد نہیں رہا۔ اسے شیلہ کہیں۔ اُس کا بھائی اور باپ بھی ساتھ آگئے اور اُن کے ساتھ محلے کے دو معزز ہندو بھی تھے جنہوں نے مجھ سے پوچھا کہ لڑکی کو کیوں بلایا گیا ہے۔ میں نے انہیں صاف بتا دیا کہ کیوں بلایا ہے۔ انہیں یہ تسلی بھی دی کہ لڑکی کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی اور اس کی عزت کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا۔ اس کے ثبوت میں میں نے انہیں بتایا کہ لڑکی اور اُس کے والدین کی عزت کا خیال نہ ہر تاتو میں اسے دن کے وقت بلاتا۔

لڑکی کو میں کمرے میں لے گیا۔ اُس کے بھائی، باپ اور دوسرے وہندو لڑکے کو براہِ رسد میں کرسیوں پر بٹھا دیا۔ لڑکی کی گھبراہٹ قدرتی تھی۔ وہ بڑی خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کی نوجوانی کا خیال آیا تو مجھے اس پر ترس آ گیا۔ جی میں آئی کہ باہر بیٹھے

ہوئے ہندوؤں سے کہوں کہ ظالمو! مذہب کی آڑ میں تم اپنی معصوم بچیوں پر کیا ظلم کر رہے ہو، لیکن میرا فرض کچھ اور تھا۔ کسی کے مذہب کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں تھا۔

میں نے شیلہ کی گھبراہٹ دور کرنے کی کوشش کی اور اُسے بتایا کہ اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی بشرطیکہ وہ ہر بات بتادے اور کچھ بھی چھپائے کی کوشش نہ کرے۔ میں نے اُسے یہ بھی یقین دلایا کہ وہ جو کچھ بتائے گی وہ میرے سینے میں راز رہے گا۔ اس کہنے سے باہر کسی کو کچھ بھی معلوم نہیں ہوگا اور اگر اُس نے میرے ساتھ ہیرا پھیری کی کوشش کی تو اُس کے ساتھ وہی سلوک ہوگا جو پولیس والے کیا کرتے ہیں۔

وہ ڈر گئی اور اُس نے سر جھکا لیا۔ میں نے اُس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا کہ وہ اسی عمر میں بیوہ ہو گئی ہے۔ پھر میں نے باتوں میں اُسے ایسا تازہ دیا کہ وہ جس راستے پر چل نکلی ہے اس میں وہ حق بجانب ہے۔ اُس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ مجھے اپنا ہمدرد اور غم خوار سمجھ رہی ہو۔

پینڈت، پرا رتھنا اور پیار

”ذرا اس پر غور کرو کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے“ میں نے کہا۔ ”مجھے تمہارے متعلق کچھ بتایا گیا ہے اس لیے بلایا ہے۔ تمہیں معلوم ہو چکا ہوگا کہ جسے تم دل سے چاہتی ہو اُس کا چہرہ تیزاب سے جلا دیا گیا ہے۔ اب تم اُسے پیان

نہیں سکو گی۔ وہ ہمیشہ کے لیے اندھا ہو گیا ہے۔ میں تمہاری اور زمان کی دوستی کے متعلق بہت کچھ جانتا ہوں۔“
اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اُس نے کہا۔ ”مجھے پتہ چل گیا ہے۔“
”کس نے بتایا ہے؟“

اُس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ میں نے پھر پوچھا کہ کس نے بتایا ہے۔ اُس نے ایک ہندو کا نام لیا۔ میں نے پوچھا کہ وہ کون ہے تو اُس نے سر جھکا لیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ہندو کون ہے اور اُس کے ساتھ اُس کا کیا تعلق ہے۔ میں اس شک پر کام کر رہا تھا کہ اس واردات کا باعث رقابت ہے اور اس کا تعلق شیلہ سے ہو سکتا ہے۔ شیلہ جس ہندو کا نام لے رہی تھی وہ اُس کا دوست تھا۔

”اس نے تمہیں کس طرح یعنی کن الفاظ میں بتایا تھا؟“

اُس نے کچھ وقت لگا کر اور نرمی طرح جھینپتے ہوئے بتایا۔ ”اُس نے کہا تھا کہ اب بتاؤ وہ اچھا ہے یا میں؟ وہ مجھے زمان سے تعلق توڑنے کے لیے کتا رہتا تھا۔ میں سمجھی کہ وہ اب بھی یہی کہہ رہا ہے۔ میں نے ویسے ہی کچھ جواب دے دیا تو اُس نے بتایا کہ زمان ہسپتال میں ہے کیونکہ اُس کے منہ پر کسی نے تیزاب پھینکا ہے۔۔۔۔۔ وہ اُسے ہسپتال میں دیکھ بھی آیا تھا۔ دو تین روز بعد اُس نے بتایا کہ زمان کا سارا چہرہ جل گیا ہے اور اُس کی آنکھیں بھی جل گئی ہیں۔“

”وہ خوش ہوگا۔“

”بہت خوش۔“ شیلہ نے جواب دیا۔ ”لیکن میں خوش نہیں تھی۔“

”کیا تم نے محسوس نہیں کیا کہ زمان پر تیزاب اُسی نے پھینکا ہے؟“

”اے جی!“ اُس نے جواب دیا۔ ”مجھے پہلا شک ہی ہوا تھا۔ میں نے اُسے کہہ بھی دیا تھا۔ وہ بہت گھبرایا اور قسمیں کھانے لگا۔“

”کیا وہ اتنا دلیر ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ اُس میں اتنی دلیری نہیں۔“ اُس نے کہا۔ ”لیکن کوئی پاگل ہو جائے تو کون کہہ سکتا ہے کہ اُس نے فلاں حرکت نہیں کی ہوگی؟“

لڑکی جب کھل کر بولنے لگی تو مجھے احساس ہوا کہ وہ ذہین ہے اور اس میں سادگی یا جھجک نہیں اور جس لحاظ طریقے سے وہ بیوگی گزار رہی ہے اسے وہ اپنا حق سمجھتی ہے۔ اُس کے بولنے کے انداز میں خود اعتمادی تھی، اور یہ خود اعتمادی مجھے کچھ اچھی لگ رہی تھی۔ اُس نے میرے دل میں اپنی ہمدردی پیدا کر لی۔ مجھے یہ اطمینان ہوا کہ اُس سے مجھے کوئی سراغ مل جائے گا۔

”اُس نے کبھی کوئی ایسی بات کی تھی کہ زمان کو قتل کر دوں گا یا اس قسم کی کوئی اور دھمکی؟“

”ایسی باتیں تو وہ کرتا ہی رہتا تھا۔“ اُس نے کہا۔

”تم نے زمان کے ساتھ کبھی اس کی دھمکیوں کا ذکر کیا تھا؟“

”کیا تھا۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”اُس نے دو تین بار کہا تھا کہ تم کو تو اسے پار کر دوں۔ میں نے اُسے روک دیا تھا۔“

”زمان بھی تمہیں کتا ہو گا کہ اس سے تعلق توڑ لو۔“

”ہاں، اُس نے کہا تھا۔“ شیلانے کہا۔ ”لیکن وہ میری مجبوری سمجھتا تھا۔ زمان سے پہلے میری اُس کے ساتھ دوستی تھی جو میں توڑ دیتی تو وہ مجھے اور زمان

کو پکڑا دیتا یا ہمارے راستے میں رکاوٹ بن جاتا۔ میں نے اُس کی شرط مان لی تھی اور اُس سے یہ شرط منوالی تھی کہ میں زمان کی دوستی ترک نہیں کروں گی۔ زمان نے اس صورت کو قبول کر لیا تھا۔“

یہ کوئی سچی محبت والا معاملہ نہیں تھا۔ یہ تین گنا ہنگاموں کا مسئلہ تھا۔ اگر گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو یہ ہندومت کا معاملہ تھا لیکن میں اپنے مسئلے میں الجھا ہوا تھا جو یہ تھا کہ حرم جو سرزد ہوا ہے اس کا باعث شیلہ ہے یا کوئی اور۔ مجھے نظر آنے لگا تھا کہ میرے مسئلے کا حل شیلہ کے پاس ہے۔ اُس نے تعاون کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ میں نے بہت سی باتیں کہہ سُن کر اُس سے پوچھا کہ زمان کو وہ کس حد تک پسند کرتی تھی۔

اُس نے بڑا ہی صاف جواب دے کر مجھے حیران کر دیا۔ بلا جھجک کہنے لگی۔

”سچ پوچھیے تو میں اُسے اپنا خاوند سمجھتی تھی۔ اُس نے مجھے تحفے پیش کیے۔ پیسے بھی دینے کی کوشش کی لیکن میں نے تحفے اور پیسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ ناراض ہوا تو میں نے اُسے کہا کہ میں طوائف نہیں ہوں۔ میں نے اُسے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ میں مسلمان ہو جاؤں گی بشرطیکہ وہ میرے ساتھ شادی کر لے۔ اُس نے انکار نہیں کیا تھا۔ سوچ میں پڑ گیا تھا، پھر اُس نے کہا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ میں کر کے دکھا دوں گا۔“

”تم نے کبھی اپنے ہندو دوست سے کہا تھا کہ تم مسلمان ہو جاؤ گی؟“

”میں نے اُسے صرف یہی نہیں کہا تھا کہ میں مسلمان ہو جاؤں گی بلکہ یہ بھی کہا تھا کہ میں اپنے مذہب سے نفرت کرتی ہوں۔“ شیلہ کی آواز میں جوش

اُچڑا ہوا ویران مکان

اس لڑکی کی زبان ایسی کھلی کہ وہ چپ ہی نہیں ہو رہی تھی۔ بولتی ہی چلی جا رہی تھی۔ میں اُس سے اپنے مطلب کی باتیں سُنا چاہتا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ اُس کا ہندو دوست زمان کا اور زیادہ دشمن ہو گیا ہوگا۔

”اُسے ہونا ہی تھا“۔ شیلانے جواب دیا۔ ”اُس نے مجھے قتل تک کی دھمکی دے دی تھی۔ میں نے اُس کے جواب میں اُسے کہا تھا کہ میں اُس سے تعلق توڑ لوں گی اور وہ میرے خلاف جو کچھ بھی کر سکتا ہے کرے۔ اس جواب سے وہ موم تو ہو گیا لیکن اُس کی نیت پر مجھے شک رہا۔“

”وہ سفید شلوار قمیض اور زری جوتی پہنتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”نہیں“۔ شیلانے یہ کہہ کر مجھے یالوس کر دیا۔ ”اُس نے شلوار اور زری جوتی کبھی نہیں پہنی۔ یہ مسلمانوں کا لباس ہے۔“

مجرم کی ایک نشانی اور بھی تھی جو میں نے شیلانے بتائی۔ یہ مجھے خود بخود ہی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ اُس نے کرائے کا کوئی آدمی استعمال کیا ہو۔ ہندوؤں کے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں تھی مگر مجھے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ ہندوؤں میں لڑائی مار کٹائی اور جرم کی جرأت ناپید تھی۔ میں شک کے باوجود مان نہیں سکتا تھا کہ ایک ہندو نے کسی پر تیزاب پھینکا ہو۔ یہ کسی حد تک تسلیم کیا جاسکتا تھا کہ ہندو نے اگر یہ جرأت کی ہے تو مجرم کرائے کا مسلمان ہوگا۔

پیدا ہو گیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”اُس نے کہا تھا کہ مسلمان ہو کر تم زمان کے ساتھ شادی کے خواب دیکھ رہی ہو۔ پھر اُس نے ہندو مذہب کی تعریفیں شروع کر دیں اور مسلمانوں کو پلید اور نہ جانے کیا کیا کہنے لگا۔ میں نے اُسے کہا کہ پلید تم ہو اور پلید میں ہوں اور ہم دونوں کو ہمارے مذہب نے پلید کیا ہے۔ بیوہ کو کس گناہ کی سزا دی جاتی ہے؟ مجھ جیسی شکل والی نوجوان بیوہ کو منحوس کیوں سمجھا جاتا ہے؟ کیا اپنے خاوند کو میں نے قتل کیا ہے؟ میں نے اُسے کہا کہ تمہاری بہن اس جوانی کی عمر میں بیوہ ہو جائے گی تو تم اُسے ستھرا یا دوار کا یا بنارس لے جا کر پنڈتوں اور سادھوؤں کے حوالے کر دو گے اور دل کو تسلی دے لو گے کہ وہ دوسری بیواؤں کے ساتھ مندریں بیٹھی پراختھا کر رہی ہے۔ مگر کبھی وہاں جا کر یہ دیکھنے کی جرأت نہیں کرو گے کہ وہ پراختھا نہیں پاپ کر رہی ہے۔ تم اپنے پنڈتوں کو جانے کیا سمجھتے ہو؟ پنڈت پراختھا اور پاپ کو ایک مالا میں پرو کر رکھتے ہیں.....

”اگر تم اُسے پنڈتوں کے حوالے یا کسی آشرم کے حوالے نہیں کرو گے تو وہ کوئی تم جیسا اور زمان جیسا ڈھونڈ لے گی۔ اس کھنڈر جیسے مکان بہت ہیں جہاں ہم ملا کرتے ہیں۔ میں نے اُسے کہا کہ تم آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہو کہ تمہیں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا۔ میں اپنے آپ کو دھوکے میں نہیں رکھ سکتی۔ میں مذہب کا ظلم برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے مسلمانوں کا مذہب اچھا لگتا ہے جو عورت پر یہ ظلم نہیں کرتا...“

”میری اتنی زیادہ باتوں کا اُس پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ وہ ہنس پڑا۔ وہ ایک نوجوان بیوہ کے جذبات کو سمجھتا ہی نہیں تھا۔“

میں نے شیلہ سے پوچھا کہ زمان نے اپنی بیوی کے متعلق کبھی بات کی تھی؟
اُس نے جواب دیا کہ وہ اپنی بیوی کے خلاف بہت باتیں کرتا تھا۔ کتنا تھا کہ
وہ اُسے حق سمجھتی ہے اور اُس کی پرواہ نہیں کرتی۔ زمان نے اپنی بیوی کو بتا
دیا تھا کہ وہ شیلہ کو چاہتا ہے۔ اور اُس کے ساتھ شادی کر کے اپنی بیوی کو بھی
ساتھ رکھے گا۔ طلاق نہیں دے گا۔

میرے لیے یہ خبر بھی نئی اور کام کی تھی اُس کے ساتھ اور بھی بہت سی
باتیں ہوئیں۔ ان میں ایک بات اور میرے کام کی نکل آئی۔ جہاں مسلمانوں کا محلہ
ختم ہوتا تھا وہاں سے ہندوؤں کا محلہ شروع ہو جاتا تھا۔ ان کے درمیان ایک
قدیم مکان تھا جس کا کچھ حصہ گنڈربن چکا تھا۔ آج کل آبادی اتنی بڑھ گئی ہے
کہ لوگ جھگیوں میں بھی رہتے ہیں۔ اُس زمانے میں مکان زیادہ اور انسان کم تھے۔
شہروں میں کہیں کہیں اُجرے ہوئے غیر آباد مکان ہوتے تھے جن کے متعلق مشہور
ہو جاتا تھا کہ آسیب زدہ ہیں۔ یہ مکان ایسا ہی تھا۔

شیلہ نے بتایا کہ زمان کے ساتھ اُس کی ملاقاتیں راتوں کو اُس ویران مکان
میں ہوا کرتی تھیں اور اسی مکان کے کسی کمرے میں جوا چلتا تھا۔ زمان وہاں جوا کھینے
جایا کرتا تھا۔ میں نے جوئے کے متعلق شیلہ سے پوچھا شروع کر دیا۔ اُسے یہ تو
معلوم نہیں تھا کہ جوا کھینے کو کون آیا کرتا تھا۔ زمان سے معلوم ہوا تھا کہ سیکیڑوں
(آج کل کے حساب سے ہزاروں) روپوں کی بازی لگتی ہے۔ زمان کئی بار مارا
اور کئی بار جیتا ہے۔ ایک دو بار جواروں میں لڑائی بھی ہوئی تھی۔

کوئی زخم نہیں تھا

جوئے بازی کا انکشاف ہوا تو میرے سامنے ایک اور شک آ گیا۔
مارا ہوا جوا ری بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ جوا ری جب لڑتے ہیں تو ایک دوسرے کو زخمی
طرح زخمی کرتے ہیں۔ جوا ری قتل بھی ہو جاتے ہیں۔ مجھے شک ہونے لگا کہ زمان پر نیزا
کسی جوا ری نے پھینکا ہوگا۔

اب میرا شک تین حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک شیلہ کا ہندو دوست -
دوسرا کوئی جوا ری اور تیسرا شک زمان کی بیوی پر تھا جسے میں نے ابھی دیکھا نہیں
تھا۔ وہ زمان کے ہاتھوں ستائی ہوئی تھی۔ ایسا امکان موجود تھا کہ اُس نے کسی
کو پیسے دے کر زمان کے منہ پر نیزا بھینکرایا ہو۔

شیلہ کے بعد میں نے اُس کے ہندو دوست کو تھانے بلایا اور اس کے
ساتھ ہی کینا تھ سے پوچھا کہ اُسے معلوم ہے کہ اُس کے علاقے میں جوئے بازی
کا ایک خفیہ اڈا ہے؟ اُسے معلوم نہیں تھا۔ میں مان نہیں سکتا تھا کہ اُسے معلوم
نہ ہو۔ مجبور ہو کیدار اور کانشیل لٹھانیداروں کو باخبر رکھتے تھے کہ علاقے میں کیا ہو رہا
ہے۔ بعض لٹھانیدار جواروں سے باقاعدہ فیس یا کمیشن لیا کرتے تھے۔ میں نے کینا تھ
سے پوچھ کر اُس نمبر کو بلایا جس کی ذمہ داری میں جوئے والے ویران مکان کا محلہ
تھا۔ چوکیدار کو بھی بلایا۔

یہ دونوں آئے تو میں انہیں الگ لے گیا۔ دونوں سے الگ الگ پوچھا۔

میں ان سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کبیر نامہ کو جوئے کے اس اڈے کا علم تھا یا نہیں۔ پہلے تو دونوں نے کہا کہ انہیں خود بھی علم نہیں۔ وہ مجھے نہیں جانتے تھے۔ میں نے جب اپنا آپ دکھایا تو دونوں مان گئے۔ وہ جواریوں سے کمشن لیتے تھے اور دونوں نے علاقے کے تھنیدار کو بے خبر کھا ہوا تھا۔ اڈہ ایک سکھ چلاتا تھا۔ یہ سکھ پولیس کے ریکارڈ پر تھا۔ چھتے میں دو تین راتیں وہاں جوا ہوتا تھا۔ زمان کو وہ جانتے تھے۔ وہ باقاعدہ بڑا کھیل کرتا تھا۔

میں نے اس سکھ کے علاوہ دو تین جواریوں کے نام پوچھ لیے اور کبیر نامہ سے کہا کہ انہیں فوراً تھانے میں بلا لے۔ شیلہ کا ہندو دوست آچکا تھا۔ وہ توخون سے کانپ رہا تھا۔ میں نے اُس کا خوف دور نہ کیا نہ اُس کے ساتھ دوستانہ لمبے میں بات کی۔ اُس کے نیچے سے میں زمین نکال لینا چاہتا تھا۔ وہ باہر برآمدے میں کھڑا تھا۔ میں نے اُس کی گردن پر ہاتھ رکھا اور دھکیل کر کمرے میں لے گیا۔ ”دیکھ اوئے لالے! میں نے اُسے کہا ”فوراً مان لے کہ تو نے نہان کے مینے پر تیزاب پھینکا ہے۔“

میں کن الفاظ میں بیان کر دوں کہ اُس کی کیا حالت ہوئی۔ اُس کا رنگ صاف ستھرا تھا جولا ش کی طرح سفید ہو گیا۔ آنکھوں میں جوانی کی جو چمک تھی وہ بھی سفید ہو گئی اور لوگوں کے دانت بجا کرتے ہیں اُس کے گھٹنے بجنے لگے۔ میں نے اس طرح کا پتہ ہوا آدمی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُس نے ہاتھ جوڑنے کے لیے اوپر کیے لیکن اُس میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ ہاتھ اور اوپر کر کے جوڑ سکتا۔ وہ رو پڑا۔

اُس نے چوڑی دار پاجامہ پہن رکھا تھا جو اتنا زنا آسان نہیں ہوتا۔ میں نے اُسے کہا کہ آثار بند کھول کر پاجامہ نیچے کر دو۔ وہ ڈر گیا اور سمجھا شاید میں ننگا کر کے اُسے بیدار دوں گا۔ وہ گھٹنوں کے بل گر پڑا اور میرے پاؤں پکڑ لیے۔ میں نے اُسے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور بڑی مشکل سے اُس سے پاجامہ نیچے کرایا۔ میں نے اُس کی دونوں رانیں دیکھیں۔ گھٹنوں سے نیچے تک ٹانگیں دیکھیں۔ کہیں کوئی زخم نہیں تھا۔

میں نے زری جوتی کا وہ پاؤں منگوایا جو تیزاب پھینکنے والا مجرم جاٹے واردات پر چھوڑ گیا تھا۔ میں نے اس ہندو کا پاؤں دیکھ کر ہی اندازہ کر لیا کہ جوتی بڑی ہے۔ جوتی میں اُس نے پاؤں ڈالا تو وہ دوا لگی بڑی نکلی۔

مجھے یہ تو یقین ہو گیا کہ تیزاب اُس نے نہیں پھینکا لیکن یہ شک ابھی باقی تھا کہ اُس نے کرائے کا کوئی آدمی استعمال کیا ہوگا۔ اُسے بٹھالیا اور کہا کہ وہ ابی بتا دے جس سے اُس نے زمان کے مرنے پر تیزاب پھینکوا یا ہے۔ اس کے جواب میں وہ ڈرے ہوئے بچوں کی طرح رونے لگا۔ میں نے اُس کے منہ پر تھپڑ مارا اور گرج کر کہا ”چپ ہو جا“۔ وہ تو جیسے مری گیا ہو۔

میں نے اُس سے شیلہ کے متعلق پوچھنا شروع کیا تو اُس نے شیلہ کی باتوں کی تصدیق کر دی۔ اُس نے تسلیم کیا کہ وہ شیلہ کو دھکیا دیتا رہا لیکن اُس میں اتنی ہمت نہیں کہ کسی پر کوئی وار کر سکے۔ زمان سے تو وہ ڈرتا بھی تھا۔ مختصر یہ کہ میں نے محسوس کیا کہ مجرم کے ساتھ اُس کا کوئی تعلق نہیں۔ اُس نے ہاتھ جوڑ کر کہا ”میں آئندہ شیلہ سے نہیں ملوں گا۔ اُس کی صورت نہیں دیکھوں گا۔“

اُس کے ساتھ کم دیش تین گھنٹے صرف ہوئے۔ میں نے اُسے نارنگ کر دیا لیکن اپنا ڈرائس پر رہنے دیا۔

زمان اڈے پڑجوا کیتا تھا

جوتے کا اڈہ چلانے والا سکھ آگیا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرے اور مجھے چکر نہ دے ورنہ اُس کے لیے بہت بُرا ہوگا۔ وہ جرائم پیشہ تھا۔ اُس نے مجھے کوئی پکڑ نہ دیا۔ میرے گھٹنوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”موتیاں والی سرکار کسی طرح تو روزی کمانے دو۔ چوری تم نہیں کرنے دیتے۔ جیپیں تم نہیں کاٹنے دیتے۔ اب جوا بھی نہیں کھیلنے دیتے۔ اور سرکار! میں جوا کھیلتا نہیں کھلاتا ہوں۔ دو چار روپے ہاتھ آجاتے ہیں۔“ ”تم جوجی میں آئے کرو خالصے!“ میں نے کہا۔ ”میں کیرنا تھ کے آگے تمہاری سفارش کر دوں گا۔ میرا ایک کام کر دو۔ تفتیش بھینسی ہوئی ہے۔۔۔۔۔ زمان کو جانتے ہو؟ تمہارے اڈے پر آیا کرتا ہے۔“

”جانتا ہوں موتیاں والیو!“ سکھ نے کہا۔ ”وہ ٹھیکیداروں کا بیٹا۔ کسی نے اُس کے منہ پر تیزاب ڈال کر اُس کا بیڑہ غرق کر دیا ہے۔ کہتے ہیں اندھا ہو گیا ہے۔“

”دیکھ خالصے!“ میں نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے تیزاب کس نے پھینکا ہے۔“ ”نہ سرکار!“ اُس نے کہا۔ ”معلوم ہوتا تو کیر جی کو میں اُسی دن بتا دیتا۔“

ہم تمہاری جوتیوں کے نوکر ہیں۔ بازی پر اُس کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی۔“ میں نے اُسے واردات کی رات یاد دلاتے ہوئے پوچھا۔ ”اُس رات وہ کھیلنے آیا تھا؟“

”آیا تھا۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”وہیں سے اُٹھ کر گیا تھا۔“ ”کسی کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہوا تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”وہ جیتا تھا یا ہارا تھا؟“

”کسی کے ساتھ لڑائی نہیں ہوئی تھی۔“ اُس نے کہا۔ ”وہ اتنی زیادہ قہم نہیں جیتا تھا کہ کوئی اُس پر اس طرح وار کرتا۔ میں تمہیں اُن سب کے نام بتا دیتا ہوں جو وہاں موجود تھے۔ اُن سے پوچھ لو۔“

”یاد کر کے بتاؤ کہ اُس رات تمہارے ساتھ کوئی ایسا آدمی تھا جس نے سفید شلوار قمیض پہنی ہو اور پاؤں میں زری جوتی ہو؟“

”نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”ایسا کوئی نہیں تھا۔۔۔ میں اور میرے ساتھی اُس روز سے کھوج لگا رہے ہیں کہ تیزاب کس نے ڈالا ہے۔ ہم سب کو ایک ہندو لڑکی شیلپا پر شک ہے۔ وہ زمان کو اسی مکان میں ملا کرتی تھی۔ اُس کے کسی اور چاہنے والے نے زمان پر تیزاب ڈالا ہے۔ یہ بھی سنا ہے کہ لڑکی زمان کے سوا کسی اور سے بات تک نہیں کرتی۔“

اس سے میں نے اور بھی بہت کچھ پوچھا لیکن مجھے ماننا پڑا کہ ان لوگوں پر میرا شک غلط ہے۔ تھانے میں تین اور آدمی آگئے تھے جو جوا کھیلا کرتے تھے۔ ان سے الگ الگ پوچھ گچھ کی۔ سب کے بیان سکھ سے ملتے جلتے تھے۔ آخر

میں اُس مخبر سے بات ہوئی جو اس اڈے سے واقف تھا۔ اُسے ڈانٹ پٹ کر اُس نے علاقے کے تھانیدار کو اس اڈے سے بے خبر رکھا ہوا ہے۔
”زمان کے متعلق کیا جانتے ہو؟“

”وہ وہاں جُڑا کھیلے آیا کرتا تھا۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”اور اسی مکان کے ایک کمرے میں ہندو لڑکی اس سے ملا کرتی تھی۔ اس لڑکی کو میں جانتا ہوں۔ اس کا دوستانہ ایک ہندو کے ساتھ بھی ہے۔ میں کسی تیسرے آدمی کو نہیں جانتا۔“

”جب یہ جُڑا کھیلے تھے تو تم ان کے لیے پہرے پر کھڑے رہتے تھے؟“
”جی ہاں۔“ اُس نے کہا۔ ”آپ تو سب کچھ جانتے ہیں۔ میں گلی میں ٹھنڈا رہتا تھا تاکہ کوئی گشت پر آجائے تو کھیلنے والوں کو خبردار کر دوں یا گشت والے کو باتوں میں لگا کر مکان سے دُور لے جاؤں۔“

”بخا کھیل کر جب سب نکلے تو تم نے سب کو جاتے دیکھا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”زمان کدھر کو گیا تھا؟ ذرا یاد کر کے بتاؤ کہ کوئی آدمی اس کے پیچھے جانا دیکھتا تھا۔“
”میں نے واردات والی گلی دیکھی ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”زمان نے مجھے دو روپے دیے تھے اور وہ اس گلی کی طرف چلا گیا تھا۔ باقی سب ادھر ادھر ہو گئے تھے۔ میں بھی اُدھر کو ہی چل پڑا جہر زمان گیا تھا۔ ایک گلی سے میں دوسری طرف چلا گیا۔ گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ لوگ سو گئے تھے۔ مجھے والدہ اشرف خان ملا تھا۔ اسی محلے کا حوالدار ہے۔ ہم ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ میں نے اُسے سلام کیا۔ وہ رُکا نہیں۔ ہنس کر سلام کا جواب دیا اور یہ کہہ کر آگے نکل گیا۔“

”کس مار پر جا رہے ہو۔ میں نے کہا گھر جا رہا ہوں۔ اس کے سوا میں نے کوئی اور آدمی نہیں دیکھا۔ میں گلی سے ہوتا ہوا سڑک پر چلا گیا۔“
”جُڑا کھیلنے والوں میں اُس رات سفید شلوار قمیض میں کون تھا؟“

میں نے پوچھا۔ ”کسی نے زری جُوتی پہن رکھی تھی؟“
اُس نے یاد کرنے کی کوشش کی اور بولا۔ ”جُوتی کا میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ سفید شلوار قمیض میں کوئی نہیں تھا۔“ اُس نے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا ملزم سفید شلوار قمیض میں تھا اور اُس نے زری جُوتی پہن رکھی تھی؟“

”ہاں!“ میں نے کہا۔ ”مجھے ہی رپورٹ ملی ہے۔ وہ بے قد کا ہے۔“
وہ پولیس کا مخبر تھا اور چھوٹے موٹے جرم بھی کرتا رہتا تھا۔ وہ پولیس کے طور طریقوں اور تفتیش کی باریکیوں کو سمجھتا تھا۔

”اُس رات میں نے اس محلے کا ایک ہی آدمی دیکھا تھا۔“ اُس نے کہا۔ ”لبا ندر سفید شلوار اور قمیض اور پاؤں میں زری جُوتی۔ وہ حوالدار اشرف خان تھا۔ وہ اُس گلی میں مڑ گیا تھا جو آگے جا کر واردات والی گلی سے جامتی ہے۔“
”نہیں۔“ میں نے اکتا ہٹ سے کہا۔ ”ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ زمان کی کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔ تیزاب پھینکنے والے کے ہاتھ میں تو تل یا ڈبرہ وغیرہ ہونا چاہیے تھا۔“

”اُس نے ہاتھ میں کچھ کپڑا رکھا تھا۔“ اُس نے کہا۔ ”وہ مجھے جہاں ملا وہاں بجلی کا ایک بلب جل رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ مجھے دیکھ کر وہ رُکا کیوں نہیں۔ میرے اُس کے ساتھ اچھے خاصے تعلقات ہیں۔ وہ بہت تیز چلا

جارا تھا۔“

اس سے بھی مجھے کچھ نہ ملا تو میں نے اُسے چلے جانے کو کہا۔ وہ اٹھا اور چل پڑا مگر ڈک گیا اور التعلکے لہجے میں بولا۔ ”میں نے اس اڑے کو کبیر صاحب سے خفیہ رکھا تھا۔ آپ میرے خلاف کارروائی تو نہیں کریں گے؟ میری روزی کا ذریعہ یہی ہے۔“

”تم نے کام کی کوئی بات تو بتائی نہیں۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”میرا مسئلہ ویسے کا ویسا پڑا ہے۔۔۔ جاؤ میں تمہاری سفارش کروں گا۔ تمہارے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔“

”تو اس مہربانی کے عوض ایک اور بات سن لیں۔“ اُس نے کہا۔ ”شاید آپ کو اس سے کچھ ناگوار نہ پہنچے۔ حوالدار اشرف خان کو میں نے سلام کیا تو وہ ڈکا نہیں تھا بہت تیز چلتا آگے نکل گیا تھا۔ وہ ڈک گیا اور مجھے آواز دی۔ میں دوڑا گیا۔ اُس نے کہا۔ ”کسی سے ذکر نہ کرنا کہ تم نے مجھے یہاں دیکھا تھا۔ اگر کسی کو بتایا تو یاد رکھو اندر کا دل آگے۔“ اُس وقت میں نے دیکھا کہ اُس کے ہاتھ میں شیشے کا گلاس تھا جس میں پانی سا تھا۔ شاید شراب ہو۔“

”پھر سوچ لو۔“ میں نے اُسے کہا۔ ”تمہارے دل میں کوئی اور بات ہے تو وہ بھی بتا دو۔ کیا اشرف خان اور زمان کی دوستی یا دشمنی ہے؟“ اُس نے قسمیں کھا کر کہا کہ اُسے اور کچھ پتہ نہیں۔

میرے سامنے اب ہیڈ کانٹیل اشرف خان آگیا۔ دیکھنا یہ تھا کہ زمان کے ساتھ اشرف کی کیا دشمنی تھی، دشمنی تھی یا نہیں۔

سفید شلوار قمیض، زری جوتی اور زخم

میں اشرف خان کو نہیں جانتا تھا۔ منجر کے جانے کے بعد میں نے کیرناٹھ سے پوچھا کہ اُس کا ہیڈ کانٹیل اشرف خان کیسا آدمی ہے اور اُس کے تعلق اُس کی کیا رائے ہے۔ اُس نے بتایا کہ اشرف خان زمیڈارا خاندان کا خوب رجوان ہے۔ کچھ پڑھا لکھا بھی ہے اور بہت ہوشیار اور چلتا پرزہ ہے۔ اس کا گزارہ تھوڑے سے نہیں ہوتا۔ شاید ادھر ادھر مارتا ہے اور ٹھاٹھ سے رہتا ہے عام قسم کے ہیڈ کانٹیلوں سے بالکل مختلف ہے۔

مجھے ایسا شک نہ ہوا کہ اُس نے زمان پر تیزاب پھینکا ہو گا لیکن اُس کے ساتھ بات کرنا اس لیے ضروری سمجھا کہ وہ جائے واردات کے قریب تھا اور منجر کی اطلاع کے مطابق وہ اُس گلی میں چلا گیا تھا جو آگے جا کر واردات والی گلی سے ملتی تھی۔ واردات کا وقت تقریباً یہی تھا۔ اُس نے شور شراب مٹا کر گلا میں نے اُسے بلایا۔ وہ واقعی خوب رجوان تھا۔ اُس کا قد لمبا اور بڑا اچھا تھا۔ ”واردات کی رات بلکہ واردات کے وقت تم جائے واردات کے قریب دیکھ گئے تھے۔“ میں نے اُس سے پوچھا۔ ”کیا تم نے کوئی شور شراب سنا تھا؟ کسی کو بھاگتے دیکھا تھا؟“

”آپ کو غلط رپورٹ ملی ہے۔“ اُس نے کہا۔ ”میں ادھر نہیں گیا۔“ ”کیا تمہارے ہاتھ میں شیشے کا گلاس نہیں تھا؟“

اُس کے چہرے پر گھرا سٹ اگئی۔

”اشرف خان! جھوٹ کیوں بول رہے ہو؟“ میں نے کہا۔ ”تم یہ بھی جانتے ہو کہ دیران مکان میں نامی گرامی جوئے باز اور رجسٹرڈ بد معاش اکٹھے ہوتے ہیں۔“

”مجھے معلوم نہیں جناب!“

”کیا تم نے سفید شلوار اور سفید قمیض نہیں پہن رکھی تھی؟“ میں نے

غصے سے پوچھا۔ ”کیا تمہارے پاؤں میں زری جوتی نہیں تھی؟“

کبیر ناتھ نے مجھے بتایا تھا کہ اشرف خان ذہین اور ہوشیار ہیڈ کانسٹیبل ہے لیکن وہ مجھے کچھ اور نظر آیا وہ احمق تھا یا ڈھیٹ۔ مجھے یقین تھا کہ تجربے جھوٹ نہیں بولا۔ اشرف خان جھوٹ بول رہا تھا۔ اُس نے میرے سوال کا جواب اٹھا سادیا۔ اُس زمانے میں پولیس والے نیکر پہنا کرتے تھے۔ مجھے کچھ شک سا ہوا۔ اشرف خان کی نیکر کھٹنوں تک تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ نیکر اوپر کر کے دونوں انہیں ننگی کر دے۔

”جناب!“ اُس نے منہں کر کہا۔ ”آپ کیوں میرے سچھے پڑ گئے

ہیں۔ آپ نے مجھے مشتبہ سمجھ لیا ہے؟“

میں نے گرج کر کہا۔ ”دونوں رانیں ننگی کر دو۔ نیکر اوپر اٹھاؤ۔“

اُس نے کوئی حرکت نہ کی۔ کبیر ناتھ میرے پاس کھڑا تھا۔ وہ آگے بڑھاؤ غصے سے یہ کہہ کر کہ ذلیل انسان، تو حکم کیوں نہیں مانتا، اُس کی نیکر کے دونوں پانچنے اوپر کر دیے۔ اُس کی دائیں ران پر ٹی بندھی ہوئی تھی۔ میں نے زری جوتی

کا پاؤں پاس رکھا ہوا تھا۔ وہ اشرف خان کی طرف پھینک کر کہا بوٹ اُتار دو اور یہ پہنؤ۔

اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ جرم ایسی چیز ہے جو انسان کی عقل مار دیتی ہے۔ اشرف خان بوٹ اُتارنے سے جھبک رہا تھا۔ آخر اُس نے بوٹ اُتارا اور جوتی میں پاؤں ڈالا۔ جوتی اُسے فٹ آگئی۔

”جوتی کا دوسرا پاؤں کہاں ہے؟“

”یہ جوتی میری نہیں جناب!“ اُس نے کہا۔

”یہ زخم کیسے آیا ہے؟“

”ایک روز پاؤں پھسلا تو میں گر پڑا۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”نیچے کوپے

کا ایک ٹکڑا تھا۔ اس سے ران کٹ گئی۔“

”پٹی کس سے کر رہے ہو؟“

اُس نے ایک ڈسپنسر کا نام لیا۔ میں نے کبیر ناتھ سے کہا کہ اس ڈسپنسر کو فوراً تھانے بلاؤ۔ اُس نے ایک کانسٹیبل کو دوڑا دیا۔ اشرف خان کے متعلق پوچھا کہ کہاں رہتا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ پہلے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ تین چار مہینوں سے تھانے کے ایک کمرے میں رہتا ہے۔ میں اُس کے ساتھ اُس کے کمرے میں چلا گیا اور اُسے کہا کہ صندوق اور کس کھولو۔ کبیر ناتھ ساتھ تھا۔ اُس نے صندوق اور کس کھول دیے۔

لکڑی کے کسے سے زری جوتی کا ایک پاؤں برآمد ہوا۔ میں نے اُس پاؤں کے ساتھ رکھا جو جائے واردات سے برآمد ہوا تھا تو جوتی مکمل ہو گئی۔ دونوں

میں بال برابر فرق نہیں تھا۔

”اشرف خان!“ میں نے تحمل سے کہا۔ ”اقبال بیان دو گئے؟“
وہ ہنس پڑا۔ یہ ہنسی طنز پر تھی۔ کہنے لگا۔ ”جناب! پندرہ سال مرے
ہو گئی ہے۔ میں کوئی بیان نہیں دوں گا۔“

میں نے اور کبیر ناٹھ نے اُس کے تمام کپڑے نکال کر دیکھے۔ ایک
سفید شلوار برآمد ہوئی جو اُس جگہ سے چھٹی ہوئی تھی جہاں ران پر زخم تھا۔ دھوبی
کی دھلی ہوئی تھی۔ میں نے دھوبی کا نشان دیکھا۔ اشرف خان سے پوچھا کہ یہ
کس دھوبی کی دھلی ہوئی ہے؟

”میں کسی ایک بھی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔“ اُس نے بڑی دلیری
سے جواب دیا۔

میں نے کبیر ناٹھ سے کہا کہ ملازموں (تھانے کے ٹٹان) کے کپڑے
دھونے والے دھوبی کو بلواؤ اور اسے (اشرف خان کو) حوالات میں بند کر دو۔

شلوار خون سے لال تھی

ڈسپنسر آگیا اور دھوبی کو بھی بلایا گیا۔ میں نے ڈسپنسر سے پوچھا کہ اُس
نے ہیڈ کاسٹیل اشرف خان کی پہلی ٹی کب کی تھی۔ ڈسپنسر میرے منہ کی طرف
دیکھتا رہا پھر اُس نے کبیر ناٹھ کی طرف دیکھا جیسے وہ صحیح جواب دینے سے ڈر رہا ہو۔
”برو بھائی!“ میں نے اُسے کدھے سے جھنجھوڑ کر کہا۔ ”میں نے

کیا پوچھا ہے؟“

اُس نے سوچ کر ایک رات بتائی جو تقریباً واردات کی رات تھی۔ وقت
گیارہ بجے کا بتایا۔ اشرف خان نے اُسے گھر سے جگایا تھا اور کہا تھا کہ اُس کی
لڑائی ہو گئی ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ کسی کو پتہ چلے اس لیے وہ اُس کی ٹی کر کے
کسی کو بتائے نہیں۔ میں نے ڈسپنسر سے کہا کہ اشرف خان نے بہت بڑا جرم کیا
ہے اس لیے وہ سب کچھ بتا دے کہ اشرف خان کے کپڑوں کی کیا حالت تھی
وغیرہ۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ اُس نے کوئی بات چھپائی تو اُسے عانتِ جرم
میں گرفتار کر لیا جائے گا۔

اس ہندو نے اپنی چھوٹی سی ڈسپنری کھول رکھی تھی۔ وہ کچھ چھپانے کی جرات
نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تو وہ بتا چکا تھا کہ اشرف خان نے اُسے کہا تھا کہ کسی کے ساتھ
لڑائی ہو گئی ہے۔ اُس نے مزید بتایا کہ اُس کی شلوار خون سے لال تھی اور دوسری
ٹانگ سے شلوار پر زمین کی رگڑ تھی۔ اُس کے پاؤں میں ایک ہی جوتی تھی جو زری
تھی۔ دوسرے پاؤں سے وہ ننگا تھا۔ شلوار سفید تھی۔ میرے پوچھنے پر اُس
نے بتایا کہ وہ اشرف خان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ اس ڈسپنسر
کے پاس دوائی لینے جایا کرتا تھا۔

سترہ اٹھارہ دن ہو گئے تھے۔ ڈسپنسر ابھی تک اُس کا زخم ٹھیک نہیں
کر سکا تھا۔ ڈسپنسر نے بتایا کہ زخم کبھی ہے اور ترچھا ٹیڑھا سا بھی۔ میں نے بڑی
کی وہ اگھڑی ہوئی پتلی دیکھی تھی جو اشرف خان کو لگی تھی۔ خاصی موٹی تھی اور تقریباً
ڈیڑھ انچ چوڑی تھی۔ اشرف خان ابھی تک ڈسپنسر سے ٹی کرار کرتا تھا۔

ایک تو یہ ہمارا گواہ ہو گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ دھوبی آگیا ہے۔ ڈسپنسر کو فراغ کر کے میں نے دھوبی کو بلایا۔ وہ بھی کچھ بتانے سے ڈرتا تھا۔ جب میں نے اُس پر اپنا ڈرسوار کیا تو اُس نے بتایا کہ سترہ اٹھارہ روز گزرے، سوالدار اشرف خان نے آدھی رات کو اُس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دھوبی باہر نکلا تو لائٹیں کی روشنی میں اُس نے اشرف خان کو دیکھا۔ اُس کی شلوار خون سے لال تھی۔ اشرف خان نے اُسے کہا کہ وہ کسی کی شلوار قمیض اُسے دے دے اور اُس کی شلوار قمیض فوراً بھٹی چڑھا دے لیکن کسی کو پتہ نہ چلے۔ اُس نے دھوبی کو بہت ڈرایا۔

دھوبی نے اُسے کسی کے استری کیے ہوئے کپڑوں میں سے شلوار قمیض نکال دی جو اُس نے ہین لی۔ صبح ہوتے ہی اشرف خان کپڑے واپس کر گیا۔ دھوبی نے اُس کی شلوار قمیض رات کو ہی پانی میں ڈال دی تھی تاکہ خون کے داغ بچنے نہ جائیں۔ میں نے یہ شلوار قمیض جو اشرف خان کے صندوق سے برآمد کی تھی دھوبی کو دکھائی۔ شلوار ران سے بچھی ہوئی تھی۔ دہاں سے پتہ چلا کہ اُس نے اُتری تھی۔ دھوبی نے شلوار پہچان لی۔

انسانی فطرت ایک عجوبہ

میں نے کبیر ناتھ سے کہا کہ واردات کی رات تھانے میں زمان کو رٹھی پر لایا گیا تھا۔ تھانے میں ہلچل مچی ہوگی۔ کاغذی کارروائی ہوئی تھی۔ مضبوط کو ہسپتال لے جانے کا مسئلہ پیدا ہوا تھا۔ کیا اُس نے دیکھا نہیں کہ ہیڈ کاسٹیل

اشرف خان تھانے سے غیر حاضر تھا؟ کسی نے یہ تو دیکھا ہوگا کہ وہ آدھی رات کے بعد واپس آیا تھا۔

کبیر ناتھ نے بتایا کہ اُس نے اشرف خان کے متعلق پوچھا تھا کہ کہاں ہے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ فلم دیکھنے گیا ہے۔ وہ چونکہ خود سراسر آدمی ہے، اس لیے اُس نے کبیر ناتھ سے جانے کی اجازت نہ لی، بہر حال تمام سٹاف سے پوچھا گیا تو دو کانسٹیبلوں نے اُسے بتایا کہ اشرف خان آدھی رات کو کھپلی طرف سے تھانے میں آیا تھا اور اُس نے وہ کپڑے نہیں پہن رکھے تھے جو وہ پہن کر تھانے سے نکلا تھا۔ اُس کے ایک پاؤں میں جوتی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ وہ کچھ پڑے پھیل کر گر پڑا تھا۔ کپڑے خراب ہو گئے اور ایک جوتی ٹوٹ گئی ہے اور وہ ایک دوست کے کپڑے پہن کر واپس آیا ہے۔

اب شک و شبہ کی گنجائش نہ رہی۔ تیزاب ہیڈ کاسٹیل اشرف خان نے ہی پھینکا تھا۔ اُس نے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے اُس کے اقبالی بیان کی ضرورت تھی۔ مقدمہ تیار کرنا تھا۔ میرے لیے یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ اُس کی زبان کے ساتھ کیا دشمنی تھی۔ اقبالی بیان کے بغیر بھی میں مضبوط مقدمہ تیار کر سکتا تھا۔ تھانداروں کو اکثر خانہ پُری کرنی پڑتی ہے۔ وہ میں بھی کر سکتا تھا جو میں نے کی بھی تھی۔ یہ تو یقین ہو چکا تھا کہ مجرم ہی ہے۔ چنانچہ میری کوشش یہ تھی کہ شہادت کی کمی کے باعث یہ بری نہ ہو جائے۔ اشرف خان کو مقدمہ واردات پر کسی نے نہیں پہچانا تھا۔ ریڑھی والے دونوں آدمیوں نے کہا تھا کہ وہ مجرم کو نہیں پہچان سکے کیونکہ اُس کا چہرہ بگڑی میں چھپا ہوا تھا اور روشنی بھی ٹھوڑی تھی۔

ملزم کی شناخت کا ایک قانونی طریقہ ہوتا ہے۔ اُسے دس بارہ آدمیوں میں کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ ایک مجسٹریٹ موجود ہوتا ہے۔ مرقعے کے گواہ سے کہا جاتا ہے کہ وہ ملزم کو پہچانے۔ اسے شناخت پریڈ کستے ہیں۔ میں نے بھی شناخت کا یہی طریقہ اختیار کیا تھا لیکن غیر قانونی حرکت یہ کہ ریڑھی والے دونوں آدمیوں کو تھکانے بلانے انہیں اشرف خان دکھا دیا تھا۔ شناخت پریڈ میں انہوں نے اُسے فوراً شناخت کر لیا تھا۔ میں نے انہیں یہ بھی کہا تھا کہ عدالت میں اپنے بیانوں میں یہ نہ کہیں کہ ملزم کا چہرہ گپڑی میں چھپا ہوا تھا۔

میں نے اشرف خان کو حوالات سے نکلوا کر اپنے سامنے بٹھالیا۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے اور خوشمال زیندار گھرانے کا آدمی تھا۔ اُس دور میں پولیس حوالدار کی بڑی شان ہوا کرتی تھی۔ اشرف خان تو اور زانیہ شاندار حوالدار تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس نے بڑے مالدار گھرانے میں دشمنی اور دوستی لگائی تھی۔ اُس کے چہرے مہرے اور قد بُت میں بہت کشش تھی۔

”اشرف خان!“ میں نے اُسے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ”تم نے چوری نہیں کی۔ مردوں والا کام کیا ہے۔ اب مردوں والا ایک کام اور کر دو۔۔۔ اقبالی بیان دے دو۔“

”بیان نہ دوں تو؟“

”اپنے دل کے بادشاہ ہو۔“ میں نے کہا۔ ”تم مجھے نہیں جانتے۔ میں نے ملزم پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اس کے بغیر ہی اقبالی بیان لے لیا کرتا ہوں اور ملزم کو جس قدر فائدہ دلا سکتا ہوں، عدالت میں دلا دیتا ہوں۔ خدا گواہ ہے اشرف!

میں نے اقبالی بیان لے کر بھی بعض ملزم بری کرانے ہیں۔ اگر تم بیان زیر دفعہ ۱۶۴ دے دو گے تو فائدے میں رہو گے میں احسان کا کچھ بدلہ تو ضرور دوں گا۔ اگر نہیں گے تو سوچ لو میں علاقے کا تھکانے دار نہیں، سی۔ آئی۔ اے کا انسپکٹر ہوں۔ تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور وہاں گورے انسپکٹر ہیں۔ تم تو جانتے ہو کہ سی۔ آئی۔ اے کو درلی جتھہ کہا کرتے ہیں اور کیوں کہا کرتے ہیں؟

”آپ مجھے ڈرانے کی کوشش نہ کریں۔“ اُس نے کہا۔ ”میں آپ کے خوف سے کوئی بات نہیں کروں گا۔“

”ادرم مجھے لکارنے کی کوشش نہ کرنا۔“ میں نے کہا۔ ”میں اپنا کیس خراب نہیں کروں گا۔ سوچ لو۔ خاندانی آدمی ہو۔ مجھ سے اپنی عزت کراؤ۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ میرے پاس شہادت مکمل ہو گئی ہے۔ تم پولیس میں اتنی زیادہ سر دس کر چکے ہو۔ اچھی طرح جانتے ہو کہ شہادت کے خالی خانے کس طرح پُر کیے جاتے ہیں۔ تم جس ریڑھی سے ٹکرا کر زخمی ہوئے تھے، اس کے ساتھ دو آدمی تھے جنہوں نے تمہیں پکڑ لیا تھا اور تم نکل گئے تھے۔ دونوں تمہیں پہچانتے ہیں۔ اس خیال میں نہ رہنا کہ تم نے منہ صافنے میں چھپا رکھا تھا۔ میں نے انہیں تمہارا منہ دکھا دیا ہے۔۔۔ اگر کیس لڑنے کی سوچ رہے ہو تو کبیر ناتھ سے پوچھ لینا کہ میں اپنا کیس کس طرح لڑا کرتا ہوں۔“

چند اور مکالموں کے بعد راجن میں بعض آج کل کی پنجابی فلموں جیسے تھے اور کچھ پرانے زمانے کی اردو فلموں جیسے پیار سے پیار سے (اشرف خان اقبالی بیان دینے پر آمادہ ہو گیا۔ اور میں نے ایک ایسی کہانی سُنی جس سے پتہ چلتا تھا

ہے کہ انسانی فطرت ایک عجوبہ ہے۔

کالابرقعہ عشق و محبت انگریزی فلموں جیسا

میں یہ کہانی اپنے انداز سے مختصر کر کے آپ کو سناتا ہوں۔

اس واردات سے چار ماہ پہلے کا واقعہ ہے اشرف خان ایک ڈیوٹی پر سٹا پر گیا۔ واپس آتے اُس کا گزر ہائیوں کے مقبرے کے قریب سے ہوا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ سیر سپاٹے کے خیال سے مقبرے کے اندر چلا گیا۔ ہمایوں کا مقبرہ وسیع علاقے میں پھیلا ہوا ہے اور اس کے بے شمار کمرے ہیں۔ شام کا وقت تھا اس لیے وہاں بہت کم لوگ تھے۔ اشرف خان ٹہلے ٹہلے اُس طرف چلا گیا جدھر کمرے لوگ جاتے ہیں۔ اُس نے دور سے ایک مرد اور ایک عورت کو دیکھا جو انگریزی فلموں جیسے عشق و محبت میں لگے تھے۔ عورت کا لے بُرقعہ میں تھی۔

ایسی حرکات کا سر عام ارتکاب جرم ہے۔ اشرف خان اُن کی طرف چلا گیا۔ وہ قانون کے احترام کی خاطر اُدھر نہ گیا بلکہ ایک شکار کی خاطر گیا۔ وہاں درخت بھی تھے اور جھاڑوں کی باڑ بھی تھی۔ ان سے گزرتے وہ جوڑا اُن کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اشرف خاں جب اوٹ سے نکلا تو دیکھا کہ مرد غائب ہے اور عورت تیز تیز چلی جا رہی ہے۔ اشرف خان وُردی میں تھا۔ اُس نے عورت کو روک جانے کو کہا اور اُس کے پیچھے بہت تیز چل پڑا۔ اُسے وہ بازاری عورت سمجھا۔ وہ نہ رُوکی۔ اشرف خان نے دوڑ کر اُسے پکڑ لیا۔

اُس نے دیکھا کہ وہ نوجوان لڑکی ہے اور بہت خوبصورت چہرے اور لباس سے وہ کسی امیر گھرانے کی لگتی تھی۔ اشرف خان نے اُس سے پوچھا کہ جو اُس کے ساتھ تھا وہ کہاں ہے۔ لڑکی نے بتایا کہ چلا گیا ہے۔ لڑکی بڑی سخت گھبرائی۔ اشرف خان نے اُسے کہا کہ اگر وہ اُس کا خاوند نہیں تھا تو وہ دن جرم کر رہے تھے اُس لیے لڑکی کو تھانے چلنا پڑے گا۔ پولیس اس کے وارنٹوں کو اطلاع دے گی۔ وہ اُسے ضمانت پر لے کر اُنہیں گے اور کس عدالت میں جائے گا جہاں سے لڑکی کو سزا ملے گی اور اُسے یہ بھی بتانا پڑے گا کہ اُس کے ساتھ کون آدمی تھا۔ اگر نہیں بتائے گی تو اس کی الگ سزا ملے گی۔ لڑکی کا رنگ پھلا پڑ گیا۔

اشرف خان نے اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکالنے کے لیے یہ بھی کہا کہ اُس پر غیر قانونی عصمت فروشی کے الزام میں مقدمہ چلے گا۔ لڑکی کو چکر آ گیا اور وہ گرنے لگی۔ اشرف خان نے اُسے بازوؤں میں تھام لیا۔ وہ وُردی میں تھا اور ہیڈ کانسٹیبل بھی تھا، اس لیے اُسے کسی کا ڈر نہیں تھا۔ اُس نے لڑکی کو بازوؤں پر اٹھایا اور ایک کمرے کے باہر لے دیا۔ شام ہو چکی تھی۔ ایک آدمی نظر آیا۔ اشرف خان نے اُسے بلا کر کہا کہ کہیں سے ایک گلاس پانی لے آؤ۔

پانی آ گیا۔ لڑکی ہوش میں آ رہی تھی۔ اشرف خان نے اُسے پانی پلایا اور کہا کہ ڈر نہیں میں مسلمان ہوں۔ کالابرقعہ نشانی تھی کہ لڑکی مسلمان ہے۔ پانی لانے والے کو اشرف خان نے بھگا دیا۔ لڑکی رونے لگی۔ اُس نے اشرف خان کی منت سماجت کی کہ وہ اُسے جانے دے۔ اشرف خان نے پہلے تو پولیس کا رُعب جاری رکھا پھر اُس پر یہ ظاہر کرنے لگا کہ اُسے اُس پر رحم آ رہا ہے لیکن وہ اپنی ڈیوٹی

سے مجبور ہے۔ اس طرح اُس نے لڑکی کو اتنا دام کر لیا کہ وہ اُس کے اشاروں پر چپا کو تیار ہو گئی۔

آسمان سے ڈری کھجور میں اٹکی

اُس نے لڑکی سے پوچھا کہ اُس کے ساتھ کون تھا۔ لڑکی نے دانت پیس کر کہا کہ وہ بزدل اور کمینہ آدمی ہے۔ وہ اپنے خاوند کو دھوکہ دے کر اور اپنے ماں باپ سے جھوٹ بول کر کہ ایک سیلی سے مٹنے جا رہی ہے، اس آدمی سے مٹنے یہاں آئی تھی۔ وہ اُسے اکیلا چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔

اشرف خان کے اس وعدے پر کہ وہ اُسے گھر چھوڑ آئے گا، لڑکی نے اُسے اپنے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ وہ زمان کی بیوی تھی۔ اُس نے جب زمان کا نام پتہ بتایا تو اشرف خان نے کہا کہ وہ زمان کو بہت اچھی طرح جانتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ اُس کے تعلقات ایک ہندو لڑکی کے ساتھ ہیں اور وہ جو ابھی کھینکتا ہے۔ لڑکی نے اشرف خان کی ٹھوڑی تمام کرالنجائی کہ وہ زمان کو پتہ نہ چلنے دے اشرف خان نے اُس سے پوچھا کہ وہ زمان جیسے خوبصورت جوان کو پسند نہیں کرتی؟ لڑکی نے اُسے بتایا کہ زمان اُس کے ساتھ کیا سلوک کر رہا ہے۔ اُسے طعنے دیتا رہتا ہے کہ اُس نے اُسے خریدا ہے۔ میں آپ کو لڑکی کے ساتھ زمان کا جو سلوک سنا چکا ہوں، وہ لڑکی نے اشرف خان کو سنا دیا اور کہا کہ اُس کے دل میں زمان کے لیے صبر و نفرت ہے۔ یہ جو اُس کے ساتھ تھا اُس کی برادری کا ایک شادی شدہ جوان سال گذر

تھا۔ لڑکی نے زمان سے انتقام لینے کی خاطر اس آدمی کے ساتھ دوستی کر لی تھی۔ اس آدمی نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ زمان سے طلاق لے لے تو وہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر اُس کے ساتھ شادی کر لے گا۔

یہاں میں اپنی رائے ایک بار پھر دے دوں۔ یہ پورا خاندان دولت کی فراوانی اور انگریزوں کی چال بازی کی وجہ سے اوجھا تھا۔ ذہنی طور پر یہ لوگ پست تھے۔ دولت انسان کی شخصیت اور کردار کو بہتر نہیں بنا سکتی۔ اس کی نشوونما اور بہتری کو روکنے والی ہے۔ میں اس لڑکی کو مظلوم نہیں کہوں گا۔ وہ بھی اپنے خاندان اور زمان کی طرح اوجھن پر اُتر آئی تھی۔ اُن کے ہاں محبت اور نفرت کا تصور کچھ اور تھا۔ وہ اونچے چوہا رول مثل حبیبی حویلی، زبورات، قہمتی اور جیٹر کیلے لباس کو شخصیت سمجھتے تھے۔ اُن کے ہاں تعلیم بھی نہیں تھی۔ مرد تھوڑا تھوڑا پڑھے لکھے تھے۔ عورتیں اُن پڑھتھیں۔ میں یہ بات تو بہت ہی پُرانی سن رہا ہوں لیکن پاکستان میں ایسی شخصیتیں عام پائی جاتی ہیں۔ سمندر پار کا پیسہ اس قسم کی شخصیتوں میں اضافہ کر رہا ہے۔

لڑکی نے اشرف خان کو بتایا کہ انتقام کے علاوہ وہ جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو گئی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اُسے کوئی دل سے چاہے اور وہ محبت کے نشے سے سرشار ہو۔ اشرف خان نے اُسے کہا کہ اُس نے محبت کے لیے ایسا آدمی تلاش کیا ہے جو آگ اور سمندر میں کود جانے کی بجائے ایک پولیس حوالدار کو دیکھ کر بھاگ گیا ہے۔ کیا اب بھی وہ اُسے چاہے گی؟ لڑکی نے نفرت سے کہا کہ اُس پر وہ سولنعت بھیجے گی۔

اشرف خان نے اُسے بتایا کہ اُسے وہ صرف حوالدار نہ سمجھے۔ وہ امیر کبیر

زمیندار کا بیٹا اور بہت بڑی جائیداد کا وارث ہے۔ اشرف خان جو ان بھی تھا اور بڑا بھائی بھی۔ اُس نے لڑکی سے محبت کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ اُسے بتائے گا کہ مرد کیسے ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے لڑکی سے کہا کہ ایک عورت کے ذریعے وہ اُسے پیغام بھیجا کرے گا اور وہ آجایا کرے۔ اگر اُس نے ٹال ٹول کی تو وہ زمان کو اور اُس کے ماں باپ کو بتا دے گا کہ اُس نے لڑکی کو کہاں پکڑا تھا اور وہ انہیں کچھ غلط باتیں بھی بتائے گا۔

اُس زمانے میں بلیک میل کا لفظ عام نہیں تھا۔ اشرف نے یہ لفظ جانے بغیر لڑکی کو بلیک میل کرنا شروع کر دیا۔ وہ اُسے تانگے پر بٹھا کر اُس کے گھر کو لے چلا۔ خود سائیکل پر تھا۔ وہ لڑکی کے گھر سے کچھ دور چل گیا۔ اُس نے لڑکی کو اگلی ملاقات کا دن، وقت اور جگہ بتا دی تھی۔

حسن اور دولت کے غرور کی سزا

لڑکی آگئی۔ وہ اشرف خان کو پہچان نہ سکی۔ وہ اب وردی میں نہیں بلکہ اُس وقت کے بڑے اچھے کپڑوں میں تھا۔ لڑکی اُس سے ڈری ہوئی تھی لیکن اشرف خان استاد کھلاڑی تھا۔ اُس نے لڑکی کے دل میں ڈر کی جگہ محبت پیدا کر لی۔ اس ملاقات کے بعد سات آٹھ دن کے وقفے سے اُن کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ لڑکی اشرف خان کو بتاتی رہتی تھی کہ اُس کے ساتھ زمان کا سلوک بد سے بدتر ہوتا جا رہا ہے۔ زمان نے اُسے جلانے کے لیے یہ بھی کہنا شروع کر دیا تھا کہ ایک ہندو لڑکی کے ساتھ اُس

کی دوستی ہے اور وہ اُس پر مرقی ہے۔ زمان کی بیوی نے اپنی ماں کو جو باتیں نہیں بتائی تھیں وہ اشرف خان کو بتاتی رہی۔ مثلاً زمان اور بیوی کے تعلقات اس قدر کشیدہ ہو گئے تھے کہ وہ برائے نام میاں بیوی رہ گئے تھے۔ زمان اُس سے نفرت کا کھلم کھلا اظہار کرتا تھا۔

وہ جوں جوں نفرت کا اظہار کرتا تھا لڑکی اتنی ہی اشرف خان میں ساقی چلی جا رہی تھی۔ آخر ایک روز زمان نے اُسے کہا کہ ہندو لڑکی اُس کی خاطر مسلمان ہونے کو تیار ہے اور وہ اُس کے ساتھ شادی کر لے گا۔ زمان نے بیوی سے کہا کہ وہ اُسے طلاق نہیں دے گا بلکہ سو کن کو گھر میں لا کر اُس کے ساتھ رکھے گا۔

لڑکی کو زمان کی یہ بات بہت بُری لگتی تھی کہ وہ اپنے مرداءِ خن کا اٹھتے بیٹھے ذکر کرتا اور بیوی کو اپنے مقابلے میں بد صورت کہتا تھا۔ اُس کی بیوی کے سینے میں نفرت اور طعنوں کا جو غبار بھرتا جا رہا تھا، وہ انتقام کی آگ کی صورت اختیار کرنے لگا۔ اگر وہ اکیلی ہوتی تو خود کشی کر لیتی یا روتی کڑھتی رہتی۔ اُسے اشرف خان مل گیا تھا۔ وہ اُس کے دل میں زمان کے خلاف نفرت کو بڑھاتا رہا اور اُسے انتقام کے طریقے بتاتا رہا۔ ایک شام لڑکی نے اشرف خان کو اُس عورت کی وساطت سے بلایا اور اشرف خان نے مقرر کر رکھی تھی۔ یہ ملاقات شاہی قلعے میں ہوئی۔ لڑکی بہت روتی اور کہنے لگی کہ وہ زمان سے اس قدر تنگ آ گئی ہے کہ زہر کھا کر مر جائے گی مگر وہ زمان سے ایسا انتقام لینا چاہتی ہے کہ وہ زندہ رہے اور ساری عمر یاد رکھے۔ اُسے زمان نے اپنی اور ہندو لڑکی کی فوٹو دکھائی تھی۔ دونوں بڑی ہی ہیروہ پوزیشن میں تھے۔ زمان کی بیوی کے لیے یہ چوٹ ناقابلِ برداشت تھی۔

بیوی کتنی ہی شریف کتنی ہی بے بس اور بے سہارا کیوں نہ ہو، وہ خاوند کا ایسا سلوک برداشت نہیں کر سکتی۔ بعض خاوند بیویوں کو ذرا سی باتوں پر ٹوکتے رہتے ہیں اور ان پر اپنی ڈکٹیٹر شپ ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے خاوند بیویوں کی نظروں میں گر جاتے ہیں۔ وہ بیویاں ایسے ہی خاوندوں کی ہوتی ہیں جو اپنی پسند کے مردوں سے آشنائی کر لیتی ہیں۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضہ ہے جو اپنے آپ کو ٹوکرا لیتا ہے۔

شاہی قلعے کی اس طلاق میں زمان کی بیوی دانستہ پسپائی کر زمان سے انتقام لینے کی باتیں کرتی رہی۔ اشرف خان نے تجویز پیش کی کہ زمان کے چہرے پر تیزاب بھینچا جائے اور جب اُس کے زخم ٹھیک ہو جائیں اور پولیس کی تفتیش ختم ہو جائے تو اُس کی بیوی اُس پر تعزین کے تیر چلانے شروع کر دے۔ لڑکی کو یہ تجویز پسند آئی لیکن سوال یہ تھا کہ تیزاب کون بھینچے اور کہاں بھینچے۔ اشرف خان کرائے کے کسی آدمی سے یہ کام کرانے کی کہہ رہا تھا لیکن خود ہی کہنے لگا کہ کرائے کا آدمی دھوکہ بھی دے سکتا ہے۔

لڑکی نے اشرف خان سے کہا کہ وہ خود یہ کام کرے۔ اُس نے اشرف خان کو یاد دلایا کہ اُس نے لڑکی سے کہا تھا کہ وہ محبت کے لیے ایسا مرد تلاش کرے جو آگ اور سمندر میں کود جائے۔ لڑکی نے اشرف خان کی مردانگی کو ایسے انداز سے لٹکا کر کہ وہ زمان کے منہ پر تیزاب بھینکنے کو تیار ہو گیا۔ لڑکی نے اُسے کہا کہ وہ اُس کے انتقام کی آگ سرد کرے تو وہ زمان سے طلاق لے کر اُس کے پاس آجائے گی۔ لڑکی اس قدر جلی ہوئی تھی کہ اُس نے اشرف خان سے کہا کہ اگر مجھ سے شادی نہ کرنا چاہو تو تمہاری داشتہ بننے کو بھی تیار ہوں۔

وہ اشرف خان کی داشتہ تو پہلے ہی بنی ہوئی تھی۔ اشرف خان پراس کے حسن

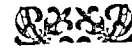
اور اپنی مردانگی کا جادو سوار ہو گیا۔ اُس نے لڑکی سے کہا کہ اب وہ زمان پر انتقامی وار کر کے اُس سے ملے گا، ورنہ اُسے اپنی شکل نہیں دکھائے گا۔ زمان کے ساتھ اُس کے مراسم تھے۔ وہ جوار یوں کے خنجر اڈے سے واقف تھا اور سکھ سے جڑا وہ چلا رہا تھا، کمشن وصول کرتا تھا۔ ایک روز اُسے پتہ چل گیا کہ آج رات جوئے کی بازی لگے گی۔ وہ زمان سے یہ معلوم کرنے کے لیے ملا کہ وہ کھینے آئے گا یا نہیں۔ زمان آ رہا تھا۔

اشرف خان نے ایک حکیم فانیساری سے تیزاب لیا اور اُسے اور زیادہ تیز کرنے کے لیے حکیم سے ایک اور چیز اس میں ملائی۔ میں تیزاب کا اور دوسری چیز کا نام نہیں لکھوں گا۔ اُس نے تیزاب کو گلاس میں ڈالوایا اور فانیساری کی دکان پر ہی رہنے دیا۔ رات دکان بند ہونے کے وقت گلاس اٹھالے گیا۔ وہ بروقت پہنچا۔ زمان جوا کھیل کر جا رہا تھا۔ اشرف خان کو ان کیوں سے واقفیت تھی۔ وہ دوسری طرف سے گلی کے موڑ پر جا کھڑا ہوا۔ جونہی زمان موڑ پر آیا اشرف خان نے تیزاب اُس کے چہرے پر پھینک دیا۔ اگر زمان جینے نہ مارتا تو اشرف خان آہستہ آہستہ چلتا کیوں میں غائب ہو جاتا مگر چیخوں نے اُسے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اتنی تیز دوڑا کہ موڑ طرقتی ہوئی ریڑھی سے بچ نہ سکا۔

باقی کہانی آپ گواہوں کی زبانی سن چکے ہیں۔ اشرف خان اور زمان کی بیوی کی ملاقات تیسری شام ہوئی۔ یہ لڑکی اس قدر خوش تھی کہ اشرف خان سے الگ ہو ہی نہیں رہی تھی۔ خوشی سے وہ پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اشرف خان نے مجھے بتایا کہ لڑکی خوشی سے اتنی پاگل ہو چکی تھی کہ بار بار کہتی تھی ”اشرف! تمہیں میرا گشت

اچھا لگتا ہے نا! لو، کھالو۔ میرے جسم کا جو حصہ اچھا لگتا ہے اسے کاٹو اور بھون کے کھالو۔ مجھے کھالو.... مجھے کھالو! اشرف!"

مگر اشرف خان اسے نہ کھاسکا۔ اسے دق کے جراثیم نے کھایا! اشرف خان کو سات سال سزائے قید ملی۔ رمان کی بیوی کو تین سال اور تیزاب تیار کر کے لینے والے حکیم کو ایک سال۔ زمان کی بیوی کو ڈیڑھ سال بعد رمانی مل گئی تھی۔ اسے جیل میں قیابی ہو گئی تھی۔ رہا ہونے کے تین ماہ بعد ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر مری۔ زمان کو تو سب سے زیادہ سزا ملی تھی۔ تاحیات اندھا پن۔ میں نے اس کا چہرہ اس وقت بھی دیکھا تھا جب اس کی پیٹیاں تزکی تھیں۔ میں سیان نہیں کر سکا کہ چہرہ کس قدر بھیانک ہو گیا تھا۔ یہ سزا خدا نے دہشتی — حسن اور دولت کے غرور اور تکبر کی سزا!



گول کا تارا

مگر کے اس حصے میں آپہنچا ہوں جہاں کبھی توکل کی بات بھول جاتی ہے اور کبھی بکپن اور لڑکپن کے واقعات بھی اس طرح یاد آ جاتے ہیں جیسے یہ کل کی باتیں ہوں۔ ایک روز لیٹے لیٹے اچانک اپنی جوانی کے زمانے کا ایک ہندو پولیس انسپکٹر جلجھون سنگھ یاد آ گیا۔ وہ راجپوت تھا۔ غالباً بھرت پور کا رہنے والا تھا۔ ایک بار ناگ پور میں ایک ڈیوٹی کے سلسلے میں اس سے ملاقات ہوئی۔ کچھ اور جلجھوں کے بھی پولیس انسپکٹر آئے ہوئے تھے۔ جلجھون سنگھ کے متعلق پتہ چلا کہ جرات مند، دیانت دار اور بڑا ہی مہین پولیس آفیسر ہے۔ ہم سب چھ سات دن اکٹھے رہے۔ جلجھون سنگھ کو میں نے سنسی مذاق کا دلدادہ پایا۔ بعد میں پتہ چلا تھا کہ وہ انسپکٹر سی سے آگے ترقی نہیں پاسکا تھا کیونکہ وہ ایک بد دیانت انگریز پولیس۔ پی سے مگر لے بیٹھا تھا۔

ایک رات ہم سب اکٹھے بیٹھے تو عجیب و غریب وارداتوں پر باتیں ہونے لگیں۔ پولیس کی نگاہ میں تو کوئی بھی واردات عجیب نہیں ہوتی کیونکہ انسان اور مجرمانہ ذہنیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ انسان کی فطرت کو ماہرین نفسیات سمجھتے ہیں یا

پولیس کے تجربہ کار افسر پولیس کسی مشتبہ کا چہرہ اور حرکتیں دیکھ کر بتا سکتی ہے کہ اس شخص کا واردات سے تعلق ہے یا نہیں۔ اصل کام یہ ہوتا ہے کہ اس سے اقبال جرم کرایا جائے اور اس کے خلاف کیس ثابت کیا جائے۔ آج کل پولیس پھر شاہی اور انسان کی پہچان میں اتنی ماہر ہوئی ہے کہ تھکانے میں کوئی رپورٹ آجائے تو تھکانے کا کلمہ رپورٹ دینے والے کے چہرے کو اور جس کے خلاف وہ کیس کرنا چاہتا ہے، اُس کے چہرے کو دیکھ کر بتا دیتا ہے کہ دونوں کتنے کتنے کی اسمیاں ہیں اور ان میں سے کون سی گائے زیادہ دودھ دینے والی ہے۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ کسی پولیس انسپکٹر کے لیے کوئی واردات عجیب و غریب نہیں ہوتی پھر بھی بعض وارداتیں تجربہ کار تھکانیہاروں کو بھی چونکا دیتی ہیں۔ کچھ دن گزرے، مجھے جگمگو بن یاد آگیا اور یہ بھی یاد آیا کہ اُس نے ایک واردات سنا لی تھی جو میں نے مختصر سی لکھ کر رکھ لی تھی۔ پُرانے کاغذات کی تلاشی لی تو اس واردات کے دو تین کاغذ مل گئے، مختصر سی تحریر کے اُدھورے اُدھورے فقرہوں سے میرے ذہن میں ساری کہانی اس طرح تازہ ہو گئی جیسے گزشتہ رات کی بات ہے کہ جگمگو بن سگھ میرے پاس بیٹھا مجھے یہ کہانی سناتا تھا اور میں اُس پر جرح کر رہا تھا کہ یہ کیسے ہوا اور تم نے یہ کیا سوچ کر کیا، وغیرہ۔

یہ کہانی آپ کو اس لیے اچھی لگے گی کہ اس میں ایک شیر کے شکار کا قصہ بھی ہے۔ میں آپ کو کہانی اپنے الفاظ میں سناتا ہوں۔

قصہ بہت پرانا ہے۔ آپ آج کل میلوں اور عرسوں پر سرکس دیکھتے ہوں گے۔ یہ لوگ سرکس کے نام کی توہین کرتے ہیں۔ یہ نٹ اور معمولی سی قسم کے بازیگر

ہوتے ہیں۔ ہمارے وقتوں میں وہ سرکس تھے کہ بعض کر تب جادو کے کھیل لگتے تھے۔ رد نیگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ ان کے شیر اور چیتے جب پنجرہوں سے نکل کر کھلے پنجرے جیسے رنگ میں آتے تھے تو اُن کی گرج اور اُن کی غصیل چو کر ایل سے پتر چلتا تھا کہ یہ جنگل کا شاہی خاندان ہے اور ان پر کنٹرول کرنے والا اجرات اور قتل کا مالک ہے۔ کبھی کبھی ایسا واقعہ بھی سننے میں آتا تھا کہ کسی شیر یا چیتے نے ان سے کر تب کرانے والے کو چیر بھاڑ دیا۔

یہ سرکس سفری (ٹورنگ) ہوتے تھے ہر سرکس کی اپنی بک کرائی ہوئی پوری لگاڑی ہوتی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے ایک قصبے کی آبادی، بعد چرٹیا کھر ستر کر رہی ہو۔ ایسا سرکس بھارت کے ایک شہر نا قصبے کریم گنج میں آیا ہوا تھا۔ یہ شہر نیپال اور بھارت کی سرحد سے کوئی پینتیس میل دور تھا۔ اس سرکس کے مالک کا نام راجن تھا جو بن سگھ اُس وقت سب انسپکٹر تھا اور کریم گنج کے تھکانے کا ایس۔ ایچ۔ او تھا۔ راجن کے سرکس کو بیاں آئے ہونے دس بارہ دن ہو گئے تھے۔

کیا شیر اور گھوڑا خود ہی چلے گئے؟

ایک رات شوختم ہونے کے دواڑھا ٹی گھنٹے بعد سرکس کے ان خیلوں میں آگ لگ گئی جس میں سرکس کے کارندے وغیرہ رہتے تھے۔ وہ میدان تھا جو زیادہ وسیع نہیں تھا اس لیے خیمے ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے تھے۔ شورات بارہ بجے کے لگ بھگ ختم ہوا تھا۔ آگ اُس وقت لگی جب سرکس والے تھکے ہوئے گہری

نہیں سوئے ہوئے تھے۔ وہاں پانی کی افراط تھی۔ قریب ہی ایک قدرتی تالاب تھا۔ سرکس کے لوگ جاگے اور جو برتن ہاتھ آیا، لے کے اُٹھ دوڑے اور تالاب سے پانی لالا کر جلتے ہوئے خیموں اور درندوں کے پیچروں پر پھینکنے لگے۔ شہر کے لوگ بھی شور مارتے رہے۔ جاگ اُٹھے اور سرکس والوں کی مدد کو پہنچ گئے۔ جگہ میں سنگھ شہر کا ایک ذمہ دار افسر تھا، وہ بھی آگیا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ درندوں سے گھوڑوں، ہاتھیوں اور بندروں نے جو شور مچایا اس سے دل پر خوف طاری ہوتا تھا۔ ایک گھنٹے میں لوگوں نے آگ بجھا دی۔ جگہ میں سنگھ اپنے گھر چلا گیا۔ اُس کا خیال تھا کہ سرکس والے پیڑ و میکس لمپ اور لائٹیں جلاتے ہیں کسی کی بے احتیاطی سے کوئی لائٹیں اُٹ گئی ہوگی جس سے آگ لگی اور پھیل گئی۔ بہر حال جگہ میں سنگھ اسے حادثاتی یا اتفاقی آگ سمجھا۔

صبح ہوئی تو سرکس کا رنگ ماسٹر اور دو اور ذمہ دار آدمی تھانے گئے اور جگہ میں سنگھ کو رپورٹ دی کہ آگ لگی نہیں لگائی تھی۔ انہوں نے سب سے بڑا نقصان یہ بتایا کہ سرکس کا مالک راجن زندہ جل گیا ہے اور اُس کی لاش جلے ہوئے خیمے میں زمین پر اوندھے منہ پڑی ہے۔ دوسرا نقصان یہ بتایا کہ پیچرے سے ایک شیر نکل گیا ہے اور پیچرے کا دروازہ بند ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کسی نے پیچرہ کھولا اور جب شیر نکل گیا تو اس آدمی نے پیچرہ بند کر دیا۔

انہوں نے تیسرا نقصان یہ بتایا کہ ایک نہایت اعلیٰ گھوڑا بھی غائب ہے جو بڑے دلچسپ کرتب دکھایا کرتا تھا۔ انہوں نے گھوڑے کا حلیہ بھی بتایا۔ سرکس کے شیریدوں وغیرہ کے پیچرے دروازوں کے کواڑوں کی طرح نہیں کھلتے۔

ایک طرف سلاخوں کا دروازہ ہوتا ہے جو پیچرے کے اوپر کھڑے ہو کر اوپر کھینچ لیا جاتا ہے۔ شیر رنگ میں آجاتا ہے جو ایک گول اور کھلا پیچرہ ہوتا ہے۔

سرکس کے ان آدمیوں نے کہا کہ شیر خود تو پیچرے کا دروازہ اوپر نہیں اٹھا سکتا تھا۔ وہ راجن کی موت اور شیر کی رہائی کو ایک جرم کی دو کڑیاں بتا رہے تھے جگہ میں سنگھ نے اُن سے کہا کہ وہ بات بالکل صاف کریں کہ انہیں ایسا شک کیوں ہے۔ وہ کوئی ٹھوس شک بیان نہ کر سکے۔

”آٹھ تو خیمے جل گئے ہیں۔“ رنگ ماسٹر نے جوائینگوائڈن بتھا، کہا۔ ”ان میں سرکس کے کارندے سوئے ہوئے تھے۔ وہ جلتے ہوئے خیموں میں سے نکل گئے تھے۔ راجن کیوں نہیں نکل سکا؟“ یہ ایسنگوائڈن خاصا ذہین معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے کہا۔ ”وہ اپنی چار پائی سے نیچے پڑا تھا۔ کیا وہ فوراً ہی اتنا بے بس یا بے ہوش ہو گیا تھا کہ وہ خیمے سے نکل نہ سکا اور وہیں اوندھے منہ گر پڑا؟“

”اُسے شراب نے بے بس اور بے ہوش کر رکھا ہوگا۔“ جگہ میں نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں آپ لوگ پانی کی طرح شراب پیتے ہیں۔“

”راجن مجھ سے زیادہ نہیں پیتا۔“ سرکس کے ایک اور آدمی نے کہا۔ ”یہ صحیح ہے کہ شراب کا نشہ انسان کو بے حال کر دیتا ہے لیکن جان کا خطرہ اُڑے تو نشہ فوراً اُڑ جاتا ہے۔“

”ہم رپورٹ لے کر آئے ہیں۔“ رنگ ماسٹر نے کہا۔ ”اور ہم آپ سے توقع رکھتے ہیں کہ آپ جل کر تفتیش کریں گے۔ ایک بڑا ہم آدمی قتل ہو گیا ہے۔ ہمارا ایک شیر اور ایک بڑا ہی قیمتی گھوڑا غائب ہے۔“

”کیا آپ کو یہ شک ہے کہ شیر اور گھوڑا چوری ہوئے ہیں؟“ — جگموہن نے پوچھا۔

”شک نہیں یقین“ — رنگ ماسٹر نے جواب دیا۔ ”گھوڑوں تک آگ نہیں پہنچی تھی۔ گھوڑے بدکتے اور ہنساتے رہے تھے۔ ان کے پھلے پاؤں مضبوط رستوں سے بندھے ہوئے تھے۔ ان سے کوئی گھوڑا آزاد نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ ہم آپ کو دکھائیں گے کہ ہر گھوڑے کی کھچلی ٹانگوں میں ٹخنوں کے قریب چڑے کے کارچڑھائے جاتے ہیں۔ یہ کارگتے کے پٹے کی طرح بالکل سے بند کیے جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ مضبوط رستہ ہوتا ہے یا زنجیر جو مضبوط کیل کے ساتھ بندھی ہوتی ہے۔ اس گھوڑے کے پاؤں کے دونوں پٹے کھلے ہوئے تھے۔ انہیں صرف انسانی ہاتھ کھول سکتے تھے۔“

جگموہن سنگھ کو کیس جبر کرنا پڑا لیکن صرف گھوڑے اور ایک شیر کی چوری کا قتل کا کیس وہ لاش دیکھ کر اور یقین کر کے کہ یہ واقعی قتل کی واردات ہے، جبر کرنا چاہتا تھا۔ مگر سر کے یہ آدمی ملنے والے نہیں تھے۔ جگموہن انہیں ٹالنا چاہتا تھا۔ وہ ان کے ساتھ چلا گیا۔

کیا اسے باندھ کر زندہ جلا یا گیا؟

جلے ہوئے خیمے میں سے راجن کی لاش اٹھائی نہیں گئی تھی۔ جگموہن سنگھ کو راجن کے خیمے تک لے گئے۔ رات ہوا کچھ تیز چلی تھی۔ خیمہ جلا اور اس کی راکھ نیچے گرنے

کی بجائے اڑتی رہی۔ راجن کی لاش زمین پر پیٹ کے بل پڑی تھی۔ جگموہن سنگھ نے لاش کو غور سے دیکھا تو ایک خاص چیز نظر آئی۔ آپ اس محاورے سے واقف ہوں گے کہ جل گئی پر بل نہ لگی۔ یہ محاورہ رسی کے متعلق ہے۔ رسی جل کر راکھ ہو جاتی ہے مگر راکھ کی شکل میں اس کے بل بدستور موجود رہتے ہیں۔ راجن نے جلی ہوئی دو رسیاں دیکھیں۔ ایک کی راکھ لاش کے ٹخنوں کے ساتھ زمین پر تھی اور دوسری لاش کی پیٹھ پر۔ لاش کے دونوں بازو پیٹھ پر تھے۔ کلاسیاں ملی ہوئی تھیں۔

جگموہن سنگھ نے رنگ ماسٹر سے کہا: ”یہ قتل کی واردات ہے۔ مقتول کے ہاتھ اور پاؤں رسیوں سے باندھ دیے گئے تھے۔ ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھے گئے تھے اور یہ چار پائی سے گرائیں بلکہ آگ لگنے سے پہلے زمین پر پڑا ہوا تھا۔“ سفزی (فولڈنگ) چار پائی جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ وہاں ایک سٹول تھا۔ دو کرسیاں اور ایک تپائی تھی اور ایک چھوٹی سی میز سب کچھ راکھ ہو گیا تھا۔

میں آپ کو ایک خاص بات بتاتا ہوں۔ جلی ہوئی رسی کی راکھ اتنی نمایاں نہیں تھی کہ ہر کوئی دیکھ کر کہہ سکتا کہ یہ جلی ہوئی رسی ہے۔ یہ جگموہن کی عقل تھی کہ اُس نے اسے جلی ہوئی رسی کہا تھا۔ رنگ ماسٹر نے ٹھیک کہا تھا کہ راجن بھاگ سکتا تھا۔ جگموہن نے بھی سوچا کہ راجن کے کپڑوں کو اگر آگ لگ گئی تھی اور وہ بیدار ہونے بل خاصا جل چکا تھا تو بھی وہ چند قدم تو بھاگ ہی سکتا تھا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے گئے تھے۔

جگموہن خیمے کی دوسری اشیاء کو دیکھنے لگا۔ میز کی راکھ پر ایک لمب پڑا تھا جو مٹی کے تیل سے جلتا تھا۔ اس کی چمبی ٹوٹی ہوئی تھی۔ جگموہن سنگھ نے رنگ ماسٹر سے

سکرس کی لڑکیاں

جگمگہن سنگھ نے لاش کی برآمدگی اور اسے پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوانے کے کاغذات تیار کیے۔ گواہوں کے دستخط لیے اور لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی۔ عام قسم کا پوسٹ مارٹم اس شہر میں ہو سکتا تھا۔ جگمگہن سنگھ نے رنگ ماسٹر اور کرس کے دوسرے دتر دار آدمیوں سے کہا کہ ان کا سکرس سفری بیگن اب انہیں تفتیش محل ہونے تک نہیں رہنا پڑے گا۔ اینگلوائڈین رنگ ماسٹر بہت تیز آدمی تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ راجن کو وہ اپنا سکا بھائی سمجھتا تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ پورا ایک سال سکرس پر تین پر رکھے گا۔ قاتل ملنا چاہئے۔

جگمگہن سنگھ نے پیچہ دیکھی جس میں سے شیر نکل گیا تھا، پھر وہ جگہ دیکھی جہاں سے گھوڑا اٹھو لایا گیا تھا۔ پٹے کا بکلی ٹوٹا ہوا نہیں کھلا ہوا تھا۔ اُسے گھوڑا نہیں کھول سکتا تھا۔ جگمگہن سنگھ نے سکرس کے کارندوں پر نظر دوڑائی جو اُدھر اُدھر کام کاج میں مصروف تھے یا پولیس کو دیکھ رہے تھے۔ اُسے سات آٹھ نوجوان لڑکیاں دکھائی دیں جو جسموں کی ساخت کے لحاظ سے تو دلکش تھیں ہی، نقش و نگار کے لحاظ سے وہ بہت ہی حسین تھیں۔ یہ سکرس کی لڑکیاں تھیں جو مختلف کرتب دکھاتی تھیں جگمگہن سنگھ کو پہلا خیال یہ آیا کہ وہ ان میں سے کسی بھی لڑکی کی خاطر دو چار آدمیوں کو قتل کر سکتا ہے اور اُسے حاصل کرنے کے لیے پورے سکرس کو آگ لگا سکتا ہے۔ لڑکیوں کے شے اور جسمانی ساخت میں انہیں سختی اور یہ بزدل آدمی کبھی مشتعل کر کے اُس سے کسی

پوچھا کہ کیا یہ لمبپ راجن کے خیمے میں جلا کرتا تھا؟ رنگ ماسٹر نے بتایا کہ یہ راجن کا لمبپ ہے۔ جگمگہن سنگھ نے دیکھا کہ اس لمبپ کا اُس جگہ سے ڈھکن غائب تھا جہاں تیل ڈالا جاتا تھا۔ اُس نے سب سے کہا کہ خیمے کے ارد گرد دیکھیں۔ لمبپ کا ڈھکن کمیں پڑا مل جائے گا۔ ڈھکن چوڑی دار ہونا چاہئے تھا۔

جگمگہن کا دماغ گہرائی میں چلا گیا تھا۔ اُسے یہ شک ہوا تھا کہ راجن کو رستوں سے باز نہ کر زمین پر پھینکا گیا اور لمبپ کا ڈھکن اُتار کر لمبپ کا تیل اُدھر اُدھر پھیل کر آگ لگا دی گئی۔ تیل راجن پر بھی چھڑکا گیا ہو گا۔ جل کر لاش کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ دیکھی نہیں جاتی تھی۔ پینے ہوئے کپڑوں کا نشان تک نہ تھا۔ یہاں میں جگمگہن سنگھ کی عقل کی تعریف کروں گا کہ اُس نے لمبپ کا ڈھکن اُتار کر دیکھ کر یہ سراغ حاصل کیا کہ اس لمبپ کا تیل خیمہ جلانے کے کام آیا ہے۔ آپ ذرا اس خیمے کو تصور میں لائیں جس میں بہت سا سامان جل کر راکھ ہو گیا اور خیمہ بھی جل گیا تھا۔ وہاں ایک لمبپ کرس کی نظر جاسکتی تھی جو آگ کی تپش سے سیاہ ہو گیا تھا اور جس کا شیشہ یعنی چینی ٹوٹ گئی تھی۔

لمبپ کا ڈھکن تلاش کے باوجود نہ مل سکا۔ اتنی راکھ میں چھوٹا سا ڈھکن کہاں مل سکتا تھا۔ جگمگہن کی خوش قسمتی تھی کہ لوگوں نے دوسرے خیروں پر پانی پھینکا تھا۔ راجن کا خیمہ پانی سے بچا رہا تھا۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ لوگوں کے بیدار ہونے تک راجن کا خیمہ جل چکا تھا۔ یہ خیمہ دوسروں سے ذرا الگ تھلک تھا۔ تیز ہوا اس کے جلتے ہوئے چیتھر سے اڑا کر دوسرے خیموں تک لے گئی یا یوں بھی جوا ہو گا کہ آگ لگانے والے نے کسی دوسرے خیمے کو بھی آگ لگا دی ہو گی جو باقی خیموں کے ساتھ تھا۔

کو بھی قتل کرا سکتی تھیں۔

جگموہن سنگھ رنگ ماسٹر اور ایک آدمی کو اپنے ساتھ بھانے لے گیا۔ یہ آدمی اُسے رنگ ماسٹر کی طرح ذہین نظر آیا تھا۔ جگموہن سنگھ نے بھانے لے جا کر انہیں بتایا کہ وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ یہ حادثہ نہیں، بہت بڑے جرم کی اور آواز ہے اور اب اُس کی ضرورت یہ ہے کہ رنگ ماسٹر اور دوسرا آدمی (جسے ہم کہانی سنانے کی خاطر مدُن کہہ لیتے ہیں) جگموہن سنگھ کے ساتھ پورا پورا تعاون کریں اور اُس سے کچھ بھی نہ چھپائیں اور کوئی بات جو اُن کے لیے خواہ بالکل معمولی ہو اُسے بتائیں۔ جگموہن سنگھ نے سب سے پہلے سرکس کی لڑکیوں کے متعلق شک کا اظہار کیا کہ ان میں سے کوئی لڑکی اس بھیانک واردات کا باعث بنی ہوگی۔ یہ رقابت ہوگی۔ راجن چونکہ سرکس کا مالک تھا، اس لیے اُس نے کسی ایسی لڑکی کو اپنی داشتہ بنا رکھا ہوگا جو کسی اور کو چاہتی ہوگی۔ اُس آدمی نے راجن کو قتل کر دیا اور سرکس کو بھی تباہ کرنے کی کوشش کی۔

”اس صورت میں اُس لڑکی کا اور اس آدمی کا غائب ہو جانا ضروری تھا۔ مدُن نے کہا۔ ”کوئی ایک بھی لڑکی غیر حاضر نہیں اور سرکس کے تمام آدمی موجود ہیں۔“ ”آپ سرکس کی دنیا سے واقف نہیں۔“ رنگ ماسٹر نے کہا۔ ”سرکس کھلے لڑکیوں کی ٹریننگ کمپن سے شروع کی جاتی ہے۔ ان کے کرتب آپ نے دیکھے ہیں تار پر چلنا، ایک پینگ سے دوسری پینگ پر الٹ بازی لگا کر جانا، زمین پر کرتب کھاتے ہوئے جسم کو بڑی طرح دوہرا کرنا وغیرہ، آپ نے دیکھا ہے۔ آپ نے ضرور سوچا ہوگا کہ ان لڑکیوں کے جسموں میں ہڈیاں نہیں، یہ تو بڑکی بنی ہوئی ہیں۔ ان کے جسموں کو ہم ڈھکی

لڑکی مانند کر دیتے ہیں۔ اتنی لچک تیس سال سے بھی زیادہ عمر تک قائم اور برقرار رکھنے کے لیے ہم ان پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ انہیں ہم بدکاری کی طرف نہیں جانے دیتے۔ کسی بھی سرکس کا مالک کرتب دکھانے والی کسی لڑکی کے ساتھ بے ہودہ چھیڑ چھاڑ نہیں کرتا۔ مدُن میں سے کسی کو داشتہ بنانے کی سوچ سکتا ہے۔ یہ لڑکیاں بہت قیمتی ہوتی ہیں۔“ ”آپ عصمت فروشوں سے واقف ہوں گے۔“ مدُن نے کہا۔ ”کوئی کتا ہم اور کوئی بھی گانے والی آپ کو اپنے ناپ چکانے سے خوش کرے گی مگر اپنا جسم نہیں بیچے گی کیونکہ اُسے اپنے جسم کی لچک اور آواز کے سوزو برقرار رکھنا ہوتا ہے۔ اسی لیے ناپچنے والیاں بڑھاپے تک ناپچنے کے قابل رہتی ہیں اور گانے والیاں یہ ضعیفی میں بھی اچھی طرح کا سکتی ہیں۔ اسی طرح ہم سرکس کی لڑکیوں کو جوانی دھل جانے تک کرتب دکھانے کے قابل رکھتے ہیں۔“

”راجن شراب پیتا تھا۔“ رنگ ماسٹر نے کہا۔ ”ہر طرح کی عیاشی کرتا تھا۔ اپنے سرکس کے اندر نہیں۔ جب سرکس کسی بڑے شہر میں جاتا تھا تو راجن باہر سے عیاش کا سامان لے آتا تھا۔“

جگموہن کو پھر بھی اطمینان نہ ہوا۔ اُس نے بہت جرح کی۔ وہ کہتا تھا کہ سرکس میں کیا مرد کیا لڑکیاں، سب انسان ہیں اور انسان اپنی عظمت کے مطابق ہوں گے۔ انہیں سکتا۔ اس جرح میں رنگ ماسٹر اور مدُن نے ایک لڑکی کا نام بتایا جو راجن کو پسند تھی اور وہ کبھی بھی راجن کے خیمے میں جایا کرتی تھی لیکن انہوں نے کہا کہ راجن اُسے بُری نیت سے نہیں بلکہ اُس کے کمالات کی وجہ سے پسند کرتا تھا۔ جگموہن کی جرح میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ یہ لڑکی ایک آدمی کو بہت پسند کرتی تھی۔ وہ رستے پر کرتب دکھایا

کرتا تھا۔ وہ بہت خوب رو اور بڑے ہی دل نشین جسم کا آدمی تھا۔ راجن کو ان کی ملاقات کی پورٹ ملی تو اُس نے دونوں کو تنبیہ کی تھی اور سمجھایا بھی تھا کہ اُن کے جسم ہی اُن کی روزی کا ذریعہ ہیں۔ جسم جتنی جلدی بیکار ہوں گے وہ اتنی جلدی بے روزگار ہوں گے۔ رنگ ماسٹر اور مدن نے بتایا کہ اُن کا کوئی سکیڈل نہیں سنا گیا مگر جگہ میں سنگھ کی تسلی نہ ہوئی۔ اُس نے اس لڑکی اور اس آدمی کو تھلے بلالیا۔

وہ عورت کون تھی؟

لڑکی کی عمر سترہ اٹھارہ سال تھی جگہ میں نے پہلے اُسے اپنے پاس بٹھایا اور اُس سے پوچھا کہ وہ راجن کو اور راجن اُسے کس حد تک پسند کرتا تھا۔ جگہ میں نے اس لڑکی کی آنکھیں اور ناک دیکھی تو صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ بہت روئی ہے۔ اب جگہ میں نے اُس کے سامنے راجن کا نام لیا تو اُس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ ”وہ میرا باپ تھا۔“ اُس نے کہا۔ ”کرس کی تمام لڑکیاں اُسے اپنا باپ سمجھتی تھیں۔“

”کیا وہ اتنا زیادہ شریف آدمی تھا؟“ جگہ میں سنگھ نے پوچھا۔ ”صرف ہمارے ساتھ شریف تھا۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ ”ویسے وہ بالکل شریف آدمی نہیں تھا۔ کرس جب کسی بڑے شہر میں جاتا تھا تو رات کو شہر سے نئی سے نئی عورت راجن کے خیمے میں آتی تھی۔“

”لیکن رستے پر کرتب دکھانے والا وہ آدمی تو راجن کو اپنا باپ نہیں سمجھتا

ہوگا جو تمہیں چاہتا ہے۔“ جگہ میں نے پوچھا۔ ”راجن اُسے تم سے ملنے سے روکاتا تھا۔۔۔ کیا یہ آدمی راجن کو اپنا دشمن نہیں سمجھتا تھا؟“

”نہیں۔“ لڑکی نے کہا۔ ”اُن کے درمیان کوئی دشمنی تو نہیں تھی۔ راجن نے ملنے سے نہیں روکا تھا۔ وہ احتیاط کرنے کو کہتا تھا۔“

جگہ میں نے اس لڑکی کے ساتھ بہت دماغ سوزی کی اور اپنا تجربہ اور ذہانت استعمال کر کے دیکھ لیا، اُسے لڑکی اور اُس کا چاہنے والا صاف نظر آئے۔ لڑکی چالاک اور ہوشیار نہیں لگتی تھی۔ وہ چالاک ہو بھی نہیں سکتی تھی کیونکہ بچپن میں وہ کرس میں آئی اور کرس میں ہی جوان ہو گئی تھی۔ ان لڑکیوں کو باہر کے لوگوں سے میل ملاقات کی اجازت نہیں تھی۔ وہ کرس کی قیدی تھیں جگہ میں سنگھ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بھولی بھالی لڑکی تھی۔

جگہ میں اتنی جلدی مطمئن ہونے والا آدمی نہیں تھا۔ اُس نے پوچھ پچھا اور جرح جاری رکھی۔ اس دوران لڑکی نے یہ انکشاف کیا کہ چند مہینے گزرے جب کرس کسی اور شہر میں تھا، ایک آدمی نے اس لڑکی سے کہا تھا کہ وہ اُس کے ساتھ چلے اور وہ اُسے اس سے ڈگنی تنخواہ دلانے کا جو اُسے اس کرس سے ملتی تھی۔ وہ ایک اور بہت بڑے کرس کا آدمی تھا۔ کرسوں کے عموماً ایک دوسرے کے اچھے فنکاروں کو الپ دیتے اور اپنے کرس میں لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔

لڑکی نے یہ پیش کش قبول نہ کی اور راجن کو بتا دیا کہ کرس کا آدمی اُسے اپنے کرس میں چلنے کو کہتا ہے۔ راجن نے اس کرس کے مالک کو بڑا سنت اور توبہ میز پیغام بھیجا تھا۔ اس لڑکی کو راجن کے اسی رد عمل کا پتہ چلا تھا۔ بعد میں جگہ میں نے

رنگ ماسٹر اور ندن سے پوچھا کہ انیس اس سلسلے میں کچھ معلوم ہے؟ رنگ ماسٹر نے بتایا کہ اُس کے ساتھ راجن نے ذکر کیا تھا۔ دوسرے سرس کے مالک نے راجن کو اُس کے پیغام کے جواب میں دھکی بھیجی تھی کہ اگر راجن نے کچھ بھی اُسے ایسا پیغام بھیجا تو وہ اپنے پورے سرس سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

”کیا ممکن ہو سکتا ہے کہ اس سرس کے مالک نے راجن کے سرس کو نقصان پہنچانے کے لیے یہ واردات کرائی ہو؟“ جگموہن نے پوچھا۔
 ”دیکھو نہیں ہو سکتا؟“ رنگ ماسٹر نے کہا۔ ”وہ سرس آج کل کلکتہ میں ہے۔“

”میں وہاں جا کر تحقیقات کر سکتا ہوں۔“ جگموہن نے کہا۔ ”لیکن مجبوری اور جاسوسی اگر آپ لوگ کریں تو میرا کام آسان ہو جائے گا۔ آپ اپنے دو تین ایسے کارندے کلکتہ بھیجیں جنہیں اُس سرس میں کوئی نہ پہچان سکے اور وہ اپنے گھوڑے اور شیر کو پہچان سکیں۔“

جگموہن نے انہیں یہ بات کہ تو دی لیکن اُسے خیال آیا کہ اگر گھوڑا اس سرس کے کسی آدمی نے چوری کیا ہے تو گھوڑے پر سوار ہو کر کلکتہ تک پہنچنا کچھ مشکل نہیں شیر کو کس طرح کلکتہ لے جایا گیا ہو گا؟ شیر گتہ نہیں تھا کہ گتے میں رسی ڈال کر ساتھ لے گئے یا اٹھا کر لے گئے۔ شیر کو شیر سے سمیت لے جایا جاسکتا تھا لیکن پتھر دیو کی مال گاڑی سے ہی لے جایا سکتا تھا۔ پتھر ہمیں پڑا تھا۔ اُس زمانے میں برائٹیٹ ٹرک نہیں چلتے تھے۔ یہ ممکن تھا کہ ملازموں نے شیر کا پتھر گھول کر شیر کو جھگا دیا اور گھوڑا لے گئے بہر حال رنگ ماسٹر نے کہا کہ وہ دو آدمی کلکتہ بھیج دے گا۔

یہ تو بعد کی بات ہے۔ جگموہن سنگھ لڑکی سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ گھوم پھر کر بات پھر راجن کے کردار پر آگئی جگموہن اب اس شک پر آ گیا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ راجن نے اس قصبے کی کسی عورت کو بچا لے لیا اور اپنے خیمے میں بلانے کی کوشش کی ہو یا کسی لڑکی کو سرس میں شامل کرنے کا لالچ دیا ہو۔ اس عورت یا لڑکی کے کو حقین کو پتہ چل گیا ہو اور انہوں نے یہ انتقامی کارروائی کی ہو۔

”جب سے تمہارا سرس یہاں آیا ہے۔“ جگموہن نے لڑکی سے پوچھا۔ ”اس شہر کی کوئی عورت راجن کے خیمے میں کبھی آئی ہے؟“

”میں نے چار پانچ روز گزرے ایک عورت کو دن کے وقت اُس کے خیمے میں سے نکلتے دیکھا تھا۔“ لڑکی نے جواب دیا۔

”اگر وہ عورت تمہارے سامنے آئے تو اُسے پہچان سکتی ہو؟“
 ”نہیں۔“ لڑکی نے جواب دیا۔ ”میں اُس کا چہرہ نہیں دیکھ سکی تھی....“
 اُس نے قیمتی کپڑے پہن رکھے تھے لیکن میں اُس کی عمر نہیں بتا سکتی کیونکہ چہرہ نہیں دیکھا تھا۔“

گول اور شیر کی دوستی

راجن کے اخلاق کی باتیں ہوز رہی تھیں۔ لڑکی سے پتہ چلا کہ راجن نے شادی کی ہی نہیں تھی۔ لڑکی پہلے بتا چکی تھی کہ راجن شریف آدمی نہیں تھا۔ اب پھر بتا ہوئی تو لڑکی نے بتایا کہ راجن کاروبار اور لین دین کے معاملے میں دیا متدار نہیں تھا۔

سکرس کے کارندوں کو وقت پر تنخواہ دے دیتا تھا لیکن جن کا گزاروں یا ٹھیکیداروں سے جائزوں کے لیے چارہ، درندوں کے لیے گوشت اور انسانوں کے لیے راشنی آتا تھا انہیں وہ پیچھے پھر اچھرا کر بیسے دیتا اور اکثر ان کی کچھ رقم مار لیتا تھا۔ لیکن دیہی کے سلسلے میں وہ کسی نہ کسی کے ساتھ لڑتا جھگڑتا ہی رہتا تھا۔

”یہ شیر جو نکل گیا ہے، یہ ہمارے پاس اُس وقت آیا تھا جب اس کی عمر تین ساڑھے تین مہینے تھی۔“ لڑکی نے بتایا۔ ”دراجن نے ابھی تک اس کی قیمت ادا نہیں کی۔ شیر کی عمر دو سال ہو گئی ہے۔ جو آدمی اس بچے کو لایا تھا وہ چار پانچ روز پہلے بھی آیا تھا۔ وہ جب بھی آتا تھا، راتیں اُسے شراب پلا کر کچھ دیر اپنے ساتھ رکھتا پھر اُسے چٹن کر دیتا تھا۔“

”اس کے ساتھ بھی راجن کا لڑائی جھگڑا رہتا ہو گا؟“ جگموہن نے پوچھا۔
 ”اس آدمی کے ساتھ راجن کے عجیب سے تعلقات تھے۔“ لڑکی نے کہا۔ ”کبھی شک ہوتا تھا جیسے ان کی گہری دوستی ہے۔ کبھی میں نے انہیں ایک دوسرے کو دھکیلا دیتے بھی دیکھا۔۔۔ میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتی کیونکہ میں ان کی ہر ملاقات کے وقت ان کے ساتھ نہیں ہوتی تھی۔“

جگموہن نے اُس سے پوچھا کہ وہ رنگ ماسٹر اور مدن کے سامنے بھی راجن کی اس بددیانتی اور کاروبار میں بد اخلاقی کی باتیں کرے گی؟ لڑکی نے کہا کہ وہ اُن کے سامنے یہ باتیں کرنے سے نہیں ڈرے گی۔ جگموہن نے رنگ ماسٹر اور مدن کو اندر بلا لیا اور انہیں بتایا کہ یہ لڑکی راجن کے متعلق یہ باتیں بتا رہی ہے۔

”راجن میں یہ بہت بڑی خرابی تھی۔“ رنگ ماسٹر نے کہا۔ ”وہ دوسروں

کی قریں دہانتا تھا۔ اس لڑکی نے آپ کو ٹھیک بتایا ہے۔“

”میں نے آپ سے کہا تھا کہ کوئی لڑکا ہر بے معنی اور معمولی سی بات آپ کے ذہن میں آئے تو وہ بھی مجھے بتائیں۔“ جگموہن نے کہا۔ ”آپ نے اتنی اہم بات مجھے نہیں بتائی۔ اس لڑکی کی باتوں سے میرے ذہن میں آتا جا رہا ہے کہ قتل کا باعث کیا ہو سکتا ہے۔ قتل کا ایک باعث یہ ہو سکتا ہے کہ اس شہر کی کوئی عورت اس کے پاس آتی تھی یا اُس نے اس عورت کو کوئی جھانسدے کر اپنے خیمے میں بلوایا تھا۔ اس عورت کے لواحقین نے راجن سے انتقام لیا ہے۔ دوسرا باعث یہ ہو سکتا ہے کہ اُس نے کسی ایسے بیو یا ری یا ٹھیکیدار کے بے ل کی ادائیگی روک لی ہوگی جس کا تعلق غنڈوں اور بد معاشوں کے ساتھ ہے۔ آپ کو شاید علم نہیں کہ کریم گنج کے بد معاش سارے صوبے میں مشہور ہیں۔“

”یہ سراسر سانی تو آپ کو کوئی ہے۔“ مدن نے کہا۔

”میں تو کروں گا ہی۔“ جگموہن نے کہا۔ ”آپ یوں کریں کہ مجھے ان ٹھیکیداروں اور دکانداروں کے نام پتے دیں جو سکرس کو گوشت اور دیگر مال سپلائی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بتائیں کہ وہ آدمی کون ہے جس نے سکرس کو یہ شیر دیا تھا جو پیچھے سے نکل گیا ہے۔“

رنگ ماسٹر اور مدن نے اُس آدمی کا نام گول بتایا اور اُس کے متعلق یہ بتایا کہ وہ اُن جگلوں میں رہتا ہے جو نیپال کی سرحد سے بھی آگے چلے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ سکرس کچھ عرصے سے اسی صوبے میں گھوم رہا تھا، اس لیے یہ آدمی راجن سے ملتا رہتا تھا۔ اُس نے سکرس کو لوگوں اور بندروں کے بچے سپلائی کیے تھے۔ ایک کچھ کا بچہ بھی

سپلائی کیا تھا اور آخر میں وہ شیر لایا تھا۔ اُس وقت یہ شیر بچہ تھا۔ گول نے اُسے تین چار مہینے اپنے پاس رکھا تھا۔ اس سے یہ ہوا کہ بچہ اُس سے مانوس ہو گیا۔ گول بچے کو یہاں لایا تو گول کے سوا کسی اور کے ہاتھ نہیں آتا تھا۔ یہ رنگ ماسٹر درندوں کو سدھانا جانتا تھا لیکن اس بچے کے ساتھ اُسے کچھ مشکل پیش آئی۔ وہ اسے سدھاسکتا تھا لیکن راجن نے گول سے کہا کہ وہ کرس کے ساتھ رہے اور اس بچے کو سدھائے۔

گول نے وہیں رہنا شروع کر دیا۔ رنگ ماسٹر کی ہدایات کے متعلق گول بچے کو سدھاتا رہا اور بچہ ٹوڑیھ پونے دو سال کا ہو کر پورا شیر بن گیا۔ یہ شیر نہیں تھا، دھاری دار تھا جسے ٹائیگر کہتے ہیں۔ اسے سنجے میں رکھا جاتا تھا کیونکہ یہ جوان شیر تھا۔ صرف گول تھا جسے دیکھ کر یہ شیر پالتو کئے کی طرح دم ہلاتا اور گول کے ہاتھ چاٹتا تھا۔ کوئی دوسرا قریب جاتا تو شیر غصے میں آ جاتا تھا۔ رنگ میں آکر رنگ ماسٹر کو پریشان نہیں کرتا تھا۔

گول کا کام ختم ہو چکا تھا۔ وہ چلا گیا۔ رنگ ماسٹر اور مدن کو معلوم نہیں تھا کہ راجن نے اس شیر کی کتنی قیمت اور اسے سدھانے کے لیے گول کی کتنی اجرت ملے کی تھی۔ انہیں صرف یہ معلوم تھا راجن نے گول کو قیمت ادا نہیں کی تھی۔ اجرت بھی شاید کم ہی دی تھی۔ البتہ راجن نے گول کو اپنا دوست بنالیا تھا اور اُسے شراب پلاتا تھا۔ اُس کا اور گول کا آپس میں لڑائی جھگڑا بھی ہو جاتا تھا۔ دو مہینہ بار رنگ ماسٹر نے گول سے کہا کہ وہ راجن کے ساتھ بدتریزی نہ کیا کرے۔ گول نے اُسے بتایا کہ راجن اُسے شیر کی قیمت ادا نہیں کر رہا۔

رنگ ماسٹر نے راجن سے کہا کہ وہ اس جنگلی کو پیسے دے دے اور اسے چلتا کرے۔ راجن نے کہا کہ شیر کی قیمت جتنی تو یہ اُس سے شراب پی چکا ہے۔ مختصر یہ کہ ان کی آپس میں حق پشلیاں چل رہی تھیں۔ آگ لگنے سے تین چار روز پہلے بھی گول آیا تھا۔ وہ اپنے سدھائے ہوئے شیر کے پیچھے کے سامنے جا کھڑا ہوا تو شیر اُسے دیکھ کر بے چین ہو گیا۔ گول نے ہاتھ پیچھے کے اندر کیا تو شیر اُس کے ہاتھ کو چاٹنے لگا۔ گول نے یہ خطرناک حرکت کی کہ پیچھے کا دروازہ اُپر اٹھا دیا۔ شیر باہر آ گیا اور گول کے پاؤں میں لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ دیکھنے والے ادھر ادھر بھاگ گئے لیکن شیر نے گول کے سوا کسی اور طرف توجہ ہی نہ دی۔ گول نے اشارہ کیا تو شیر اچھل کر پیچھے سے چلا گیا۔ گول نے دروازہ جو دراصل سلاخیں تھیں، نیچے کر دیا۔

”یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ شیر انسان کے ساتھ اتنا پیار کرتا ہے۔“ رنگ ماسٹر نے کہا۔ ”شیر کتنے کی طرح پیار کرنا جانتا ہے۔ گول نے تو اسے اپنے ہاتھ سے دودھ پلایا تھا اور شیر اسی کے ہاتھ سے کھا کھا کر جوان ہوا تھا۔ میں درندوں کی نظر کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ جنگ میں بھی وہی شیر خطرناک ہوتا ہے جو مھو کا ہو یا جس کے منہ انسانی خون اور گوشت لگ گیا ہو یا شیر اُس کے لیے خطرناک ہوتا ہے جس سے اُسے ڈر ہو ورنہ شیر حملہ نہیں کرتا۔“

گول کے متعلق رنگ ماسٹر اور مدن نے بتایا کہ وہ ہے تو جنگلی لیکن معمولی قسم کا آدمی معلوم نہیں ہوتا۔ اُس کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ بتائی گئی تھی۔ شکل و صورت بہت اچھی اور اُس کا جسم چھتر تھلا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایسا تاثر تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ دلیر اور پراسرار آدمی ہے۔

ٹھیکیدار بھی آگئے، غنڈے بھی

جگمگ بن سگھ نے گول کے متعلق بہت کچھ پوچھا جو اسے بتایا گیا لیکن کسی کی بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا تھا۔ صرف یہ معلوم تھا کہ وہ فلاں جنگلوں میں رہتا ہے۔ اتنے وسیع جنگلیں اس کی تلاش آسان نہیں تھی۔ تاہم اسے تلاش کرنا تھا جس کے لیے وقت درکار تھا۔ پولیس کے ایسے کسی کی تلاش ناممکن نہیں ہوتی۔ وقت بہت چاہیے۔

دن گزر گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ آچکی تھی۔ اس کے مطابق موت جلنے سے واقع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے یہ بھی لکھا تھا کہ مقتول کے منہ میں کپڑا ٹھونسنا ہوا تھا۔ کپڑا جو منہ سے باہر تھا وہ جل گیا تھا۔ اس سے مقتول کے ہونٹ جل کر سوچ گئے اور آپس میں مل گئے تھے۔ اندر کا کپڑا انہیں جلا تھا۔ جگمگ بن یہ کپڑا پسینے سے دیکھ سکا تھا کیونکہ لاش کے ہونٹ بند اور مٹی طرح سوجے ہوئے تھے۔ جگمگ بن سگھ نے اپنے ملاقاتی کے ڈی۔ ایس۔ پی کو واردات کی رپورٹ اور اس وقت تک جو کارروائی کی تھی، بھیج دی تھی۔ ڈی۔ ایس۔ پی انگریز تھا۔

جگمگ بن نے رنگ ماسٹر، دن اور لڑکی کو بھیج دیا اور اس آدمی کو اپنے ساتھ رکھا جو اس لڑکے کو چاہتا تھا۔ اس سے جگمگ بن نے رات بہت دیر تک پوچھ گچھ جاری رکھی اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس شخص کے دل میں لڑکی کی محبت ضرور ہے لیکن راجن کی دشمنی نہیں۔

دوسرے دن رنگ ماسٹر نے تھانے جا کر جگمگ بن کو دو آدمیوں کے نام بتائے۔ یہ دونوں کرس کو جانوروں اور کھانے پینے کا سامان سپلائی کرتے تھے۔ جگمگ بن نے دونوں کو بلایا اور اسے۔ ایس۔ آئی کے کما کے نمبروں سے کہو کہ یہ معلوم کریں کہ انہیں ٹھیکیداروں کے تعلقات غنڈوں اور بد معاشوں سے ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو وہ کون ہیں۔

ٹھیکیدار آگئے۔ جگمگ بن نے دونوں سے الگ الگ پوچھ گچھ کی معلوم ہوا کہ دونوں کی خاصی رقم راجن نے ادا نہیں کی۔ دونوں کاراجن کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہوا تھا۔ دونوں نے راجن سے کہا تھا کہ وہ بل ادا کر دے ورنہ وہ سپلائی روک لیں گے۔ راجن نے انہیں کہا تھا کہ روک لو میں بل ادا کیے بغیر کرس کو اگلے شہر لے جاؤں گا۔ انہوں نے سپلائی نہ روکی۔ راجن نے دونوں کو تھوڑے تھوڑے پیسے دے دیے۔

ان دونوں کو جگمگ بن نے نفیث میں بہت رکھا۔ تین چار گھنٹے گزر گئے تھے۔ ان میں سے ایک کے متعلق ایک مجرب نے آکر اطلاع دی کہ اس کا دوستانہ دو غنڈوں کے ساتھ ہے۔ ان دو میں سے ایک دوبار کا سزا یافتہ تھا۔ جگمگ بن نے ان دونوں کو بھی بلوایا۔ پھر دونوں ٹھیکیداروں سے الگ الگ اور دونوں غنڈوں سے الگ الگ پوچھ گچھ شروع ہو گئی۔

اس قسم کے مشتبا فراسے نفیث کسی اور انداز سے کی جاتی ہے۔ غنڈوں پر جگمگ بن نے تھوڑی دگری طریقہ (ادیت رسانی) بھی استعمال کیا تھا لیکن کسی نے بھی اقبال جرم نہ کیا۔ جگمگ بن سگھ نے انہیں چھوڑا نہیں۔ تھانے میں ہی بٹھائے رکھا۔ اس روز ڈی۔ ایس۔ پی بھی آگیا۔ واردات سن گئیں تھی۔ انگریز اپنے قانون

کی اور امن عامہ کی توہین برداشت نہیں کیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تھا نیداردن رات ایک کیے رکھتے تھے اور جو تھا نیداردن چائے پانی کے مادی تھے انہیں تو اور زیادہ محنت کرنی پڑتی تھی کیونکہ ”چائے پانی“ پر پردہ ڈالنا خاصا مشکل کام ہوتا تھا جگبوہن کے ڈی۔ ایس۔ پی نے جائے واردات دیکھی پھر جگبوہن کی کارروائی دیکھی اور اس سے پوچھا کہ وہ کس لائن پر تفتیش کر رہا ہے۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے دونوں ٹھیکیداروں سے کہا کہ جب تک وہ پولیس کو یقین نہیں دلا دیتے کہ وہ بے گناہ ہیں انہیں تھانے سے باہر نہیں جانے دیا جائے گا۔ اس سے جگبوہن سنگھ کا حوصلہ اور زیادہ بڑھ گیا۔

جگبوہن نے ڈی۔ ایس۔ پی کو گول کے متعلق تفصیل سے بتایا۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے اسے کہا کہ وہ ان جنگلوں کے علاقے کے تمام تھانوں کو اطلاع بھجوا دے جس میں گول اور گھوڑے کے خلیے لکھے جائیں شیر کے متعلق کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ کہاں گیا۔

تھانوں کو یہ اطلاع ڈی۔ ایس۔ پی نے خود بھجوا دی۔

ڈی۔ ایس۔ پی کے جانے کے بعد جگبوہن نے تفتیش جاری رکھی۔ اُدھر رنگ ماسٹر اور مدن نے سرکس کو رواں کر لیا۔ انہیں تنخواہیں دینے کے لیے سرکس کو چلانا تھا۔

نمبر دار کا پیٹ چاک ہو گیا

وقت گزرتا گیا اور تین مہینے گزر گئے سرکس وہیں رہا حالانکہ اس کی آمدنی خاصی

کم ہو گئی تھی۔ ڈی۔ ایس۔ پی خود بھی تفتیش میں دل چسپی لیتا رہا لیکن بات وہیں رہی چل پہلے دن تھی۔ رنگ ماسٹر کبھی جگبوہن سنگھ کے سر پر جاسوار ہوتا کبھی ڈی۔ ایس۔ پی کے ہاں چلا جاتا۔ اگر وہ خاموش رہتا تو جگبوہن ڈی۔ ایس۔ پی کی اجازت لے کر کبھی عدم پتہ قرار دے کر فائل کر دیتا۔

جگبوہن کی طرف سے کیس عدم پتہ ہی تھا۔ اس کا وجود صرف فائل میں رہ گیا تھا یا اسے رنگ ماسٹر اور مدن نے زندہ رکھا ہوا تھا۔ انہیں راجن کی موت کا اتنا غم نہیں تھا بلکہ وہ خوش نظر آتے تھے۔ راجن کا کوئی وارث نہیں تھا جو اس کی جگہ سرکس کا مالک بنتا۔ اب رنگ ماسٹر اور مدن اس کے مالک تھے۔ وہ مجرم کو اس لیے پکڑنے پر زور دے رہے تھے کہ انہیں ڈرتھا کہ مجرم اگر سرکس کا کوئی کارندہ ہے تو نہ پکڑے جانے کی صورت میں وہ ایسی ہی واردات دوبارہ کرے گا اور سرکس تباہ ہو جائے گا۔ ایک روز جگبوہن سنگھ کو ڈی۔ ایس۔ پی کا فون ملا۔ اس نے کہا ”معلوم ہوتا ہے تمہارا طمطم مل گیا ہے۔ جلدی آؤ۔“

جگبوہن اُسی وقت روانہ ہو گیا۔ ڈی۔ ایس۔ پی پچیس میل دور بڑے شہر میں تھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے اسے یہ کہہ کر رسیٹ ہاؤس میں بھیج دیا کہ وہاں اسے ایک انگریز میجر پٹر ہال ملے گا اور وہ اس میجر کی ساری کمائی سن کر تیس سئیتیس میل دور جانے کی تیاری کرے۔

جگبوہن رسیٹ ہاؤس میں چلا گیا جہاں میجر پٹر موجود تھا۔ انگریز افسر بڑی صاف اُردو بولا کرتے تھے۔

”دین نے اسے ایک دلچسپ کہانی سمجھ کر تمہارے ڈی۔ ایس۔ پی کو کٹائی

تھی۔“ میجر پیر نے بگوسن سکھ سے کہا ”لیکن وہ خوشی سے چونک پڑا اور کہنے لگا کہ یہ شخص جس نے اپنا نام گول بتایا ہے تمہیں مطلوب ہے۔ میں تو تانوا کے جنگل میں کار کھینے گیا تھا۔ وہاں شیر (ٹائیگر) مل جاتے ہیں۔ وہاں میں رسیٹ ہاؤس میں ٹھہرا۔ مجھے اس جنگل کے ایک باشندے کا انتظار تھا جس کا نام مجھے گول بتایا گیا تھا اور مجھے یقین دلایا گیا تھا کہ وہ نہ صرف ماہر شکاری ہے بلکہ شیر کو گھیر کر سامنے لانے کا ماہر ہے اور وہ جنگل کا بھیدی ہے۔ وہ درندوں کے منجھے ہوئے نقوش پا بھی پہچان کرتا دیا کرتا ہے کہ درندہ کس طرف گیا ہے....

”مجھے وہاں کے نبرداریے بتایا کہ گول اگلے روز پہنچ جائے گا۔ میں دن کے پچھلے پیر سیر کے لیے باہر نکل گیا۔ وہاں قدرتی پودے اور درخت بہت زیادہ تھے۔ اس سے چار پانچ فرلانگ دور تانوا گاؤں ہے جہاں زیادہ تر لوگ کسان ہیں یا جنگل میں مزدوری کرتے ہیں۔ میں اس گاؤں سے دور ایک اور طرف چلتا گیا۔ کوئی ایک میل دور گیا ہوں گا کہ آگے ایک برساتی نالہ نظر آنے لگا جس کے کنارے اوپے تھے اور نالہ خشک تھا کہیں کہیں تھوڑا سا پانی تھا....

”مجھے اپنی دائیں طرف جھاڑیوں میں سرسراہٹ سنائی دی۔ شکاری جنگل کی لسی سرسراہٹ کو نظر انداز نہیں کیا کرتے ہیں نے ٹوک کر اُدھر دیکھا تو میری رگوں میں خن ٹوک گیا اور میں بت کی طرح ساکت ہو گیا۔ مجھ سے دس بارہ قدم دور ایک شیر کھڑا مجھے گھور رہا تھا اور وہ اپنی ٹانگیں نہایت آہستہ آہستہ اس طرح دہری کر رہا تھا جس طرح شیر اپنے شکار پر بھینٹنے کے لیے کیا کرتے ہیں۔ میرے ہاتھ میں رائفل نہیں تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ شیر میاں سے دور ہوتے ہیں مگر یہ شیر گاؤں

اور رسیٹ ہاؤس کے قریب پھر رہا تھا....

”مجھے زندگی میں پہلی بار پتہ چلا کہ موت کا ذائقہ کیا ہوتا ہے۔ میں ایسی موت نہیں مرنا چاہتا تھا کہ شیر مجھ زندہ کو چیر بھاڑ دے مگر یہ میرے اختیار میں نہیں تھا۔ خدا کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ شیر نے اس طرح ایک طرف دیکھا اور ٹانگیں سیدھی کر کے جھاتی لی جیسے اُسے میرے ساتھ کوئی دل چسپی نہ ہو۔ وہ منہ پھیر کر آہستہ آہستہ چلا گیا۔ میری جان میں جان آئی۔ وہ جنگل میں غائب ہو گیا اور دور برساتی نالے میں نظر آیا پھر وہاں سے بھی غائب ہو گیا۔ میں واپس رسیٹ ہاؤس میں آ گیا....

”رات کے وقت مجھے گاؤں کی طرف سے مویشیوں کا شور و غل سنائی دیا۔ ان کی آوازوں سے پتہ چلتا تھا کہ ان پر کوئی خطرہ آن پڑا ہے۔ ذرا ہی دیر بعد اس خطرے کی آواز بھی سنائی دی۔ یہ شیر کی آواز تھی جسے شکاری پہچانتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ شیر نے مویشیوں پر حملہ کر دیا ہے۔ میں ان کی مدد کو نہیں پہنچ سکتا تھا صبح ہوئی تو گاؤں کے بہت سے آدمی میرے پاس آئے۔ وہ ہراساں تھے۔ انہوں نے بتایا کہ رات کو بہت سے مویشی ایک جگہ اکٹھے رکھے جاتے ہیں۔ ان کے ارد گرد جھاڑیوں کی باڑ ہے۔ رات کو ایک شیر باڑ کے اندر آ گیا۔ مویشی ڈر کر چینے اور بھاگنے لگے۔ فیرا دوڑا گیا۔ گاؤں کے لوگ شیر کی آواز سن کر دیکھے رہے جب خاموشی ہوئی تو لوگوں نے جا کر دیکھا۔ نبرداریوں میں ڈوبا پڑا تھا۔ وہ مر چکا تھا۔ شیر نے اُس کے ایک پیلو سے پیٹ پھاڑ ڈالا تھا۔ صبح لوگوں نے مویشیوں کو اکٹھا کیا تو پتہ چلا کہ ایک بچہ مارا ہے۔ زین پر نشان دیکھے شیر اسے گھسیٹ کر لے گیا تھا....

”میں گاؤں میں چلا گیا۔ نبرداری لاش اُس کے گھر پڑی تھی۔ اُسے دیکھا شیر

نے اُس کے صرف پہلو میں پنجہ مار کر اُس کا پیٹ چاک کر دیا تھا۔ جسم پر اور کوئی زخم نہیں تھا۔ میں نے باہر جا کر زمین دیکھی صاف نظر آ رہا تھا کہ کھجڑے کو شیر گھسیٹ کر کدھر لے گیا ہے۔ میرے ہاتھ میں رائفل تھی۔ میں اس نشان پر چلنا گیا۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ یہ شیر انسان کا گوشت کھانے کا عادی نہیں ورنہ وہ نہ بچہ کی لاش اٹھا لے جاتا۔ اُسے ایک جانور کی ضرورت تھی۔ اسے کھچڑا پسند آیا اور اُسے مار کر لے گیا۔ شیر وہ خطرناک ہوتا ہے جو انسان کے گوشت کا عادی ہو جاتا ہے۔۔۔۔

”گاؤں کے لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ اس گاؤں کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ شیر گاؤں میں آیا ہے، ورنہ یہاں دُور دُور تک شیر نظر نہیں آتا۔۔۔ میں آگے چلتا گیا۔ برساتی نالے میں سے بھی گزر گیا۔ پار چلا گیا اور بیس پچیس گز دُور مجھے مرا ہوا کھجڑا پڑا نظر آیا۔ میں ذرا قریب جا کر ایک درخت پر چڑھ گیا۔ کھجڑا صاف نظر آ رہا تھا۔ اُس کی صرف ایک ٹانگ کھائی ہوئی تھی۔ شیر کیس نظر نہیں آ رہا تھا۔ تین چار گیدڑ آ گئے اور کدھ بھی آ گئے تھے۔ میں خاصی دیر ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ شیر کا نام و نشان نہ تھا۔۔۔

یہ شخص مجھ راز تھا

”میں اس ارادے سے واپس آ گیا کہ رات کو اسی درخت پر واپس آؤں گا۔ شیر غوراً رات کو اپنے مارے ہوئے شکار پر آیا کرتا ہے۔ رسیٹ ہاؤس میں آیا تو برآمدے میں ایک دروازہ، بڑے مضبوط جسم اور اچھی شکل و صورت کا ایک آدمی بیٹھا تھا۔ اس کے پاس دو نالی بندوق تھی۔ میرا دلی اُس کے پاس کھڑا

تھا۔ اُس نے مجھے بتایا کہ یہ آدمی وہ شکاری ہے جسے میری راہنمائی اور ساتھ کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اس آدمی نے اپنا نام گول بتایا۔ میں نے شکار کے دوران ایسے بہت سے آدمی دیکھے ہیں۔ وہ مرے مرے اور جھکے جھکے سے ہوتے ہیں اور انگریز شکاریوں کے سامنے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ بہت غریب ہیں تاکہ انگریز افسر رگم کے زیادہ انعام دے جائیں، لیکن گول کے چہرے کے تاثرات میں اور اُس کی آنکھوں کی چمک میں خود اعتمادی اور وقار سا تھا۔ اُس نے مجھے اس طرح سلام کیا جیسے وہ میرے ہی عہدے کا افسر ہو۔ مجھے خوشی ہوئی کہ میں نے پہلا ہندوستانی ندکار دیکھا ہے جو اپنے آپ کو غلام اور غریب ظاہر نہیں کر رہا۔۔۔۔

”میری نظر اُس کے گھوڑے پر پڑی جو پر سے بندھا ہوا تھا۔ گھوڑا اتنی اچھی نسل کا تھا کہ مجھے یقین نہ آیا کہ جنگل کا یہ باسی اس گھوڑے پر آیا ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا، گول یہ گھوڑا کہاں سے لائے ہو؟ اُس نے جواب دیا کہ یہ ڈیڑھ دو سال سے اُس کے پاس ہے۔ ان لوگوں کے پاس گھوڑے کہاں! ان میں سے کوئی عیاشی کرے تو ٹوٹو قسم کی مرلی سی گھوڑی رکھ لیا کرتا تھا کہ میں کچھ دیر گھوڑے کو دیکھتا رہا۔“

جگوہن سنگھ نے میجر پیٹر ہال سے گھوڑے کا علیہ پوچھا۔ اُس نے علیہ بتایا تو جگوہن نے اچھل کر کہا۔ ”یہی ہے۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ایسا اعلیٰ گھوڑا کس جنگلی کے پاس نہیں ہو سکتا۔ وہ کس کا گھوڑا ہے۔“ جگوہن کو گھوڑے کا حلیہ بانی یاد تھا۔ یہ گھوڑا عام گھوڑوں سے ویسے بھی بہت مختلف تھا۔ اس کا رنگ سفید تھا اور اس پر ہلکے اور کچھ گہرے بادی رنگ کے چھوٹے چھوٹے داغ دھبے تھے۔

”میں گول کو دہن سے اپنے ساتھ گاؤں میں لے گیا۔“ میجر پیٹر ہال نے جگوہن کو سنایا۔ ”اور اُسے کہا کہ وہ اس شیر کے پنجوں کے نشان پہچان لے۔ نشان برساتی ٹالے کی ریت اور مٹی پر زیادہ صاف تھے۔ گول نے یہ نشان دیکھے تو وہ ایک نشان کے پاس بیٹھ گیا۔ میں اُس پر ہنچا گیا۔ اُس کے منہ سے بڑے دھیمی آواز میں یہ الفاظ نکلے۔ ”یہاں آگیا ہے؟“ میں نے اُس سے پوچھا۔ تم اس شیر کو جانتے ہو؟“ وہ چربک پڑا جیسے اُسے معلوم ہی نہ تھا کہ میں اُس کے ساتھ ہوں۔ اُس نے عجیب سی ہنسی ہنس کر کہا۔ ”ہاں صاحب بہادر! میں اس شیر کو پہچانتا ہوں، لیکن یہ کسی انسان پر حملہ نہیں کرے گا۔“ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ اس شیر کو کس طرح جانتا ہے؟ اُس نے اُدھوڑے اُدھوڑے سے دو تین الفاظ منہ سے نکالے پھر جیسے اُس کے ذہن میں معقول جواب آگیا ہو۔ کئے لگا۔ ”ہم لوگ جنگل کے بھیدی ہیں۔ کسی ایک شیر یا چیتے کے پاؤں کا نشان دیکھ لیں تو وہ ذہن میں بیٹھ جاتا ہے۔“

”مجھے اطمینان ہو گیا کہ بڑا ذہین گائیڈ اور مددگار شکاری مل گیا ہے لیکن شیر کے پنجے کے نشان دیکھ کر اُس کے چہرے پر میں نے جو تبدیلی دیکھی تھی وہ بلاوجہ اور بے معنی نہیں تھی۔ ہم ریسٹ ہاؤس میں آگئے۔ میرے اردلی نے میری مادت کے مطابق وہسکی کی بوتل اور گلاس میرے آگے رکھ دیا۔ میں نے ویسے ہی گول کی طرف دیکھا وہ وہسکی کی بوتل کی طرف لپچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک اور گلاس منگو کر اُسے وہسکی ڈال دی۔ یہ آدمی مجھے اچھا لگا تھا اور مجھے شک ہو گیا تھا کہ یہ شخص خود ایک عجم راز ہے یا کوئی اور خاص بات ہے

۱۴۲

جسے یہ مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ بہر حال یہ آدمی میرے لیے دل چسپ تھا۔“

انگریزوں کی ذہانت کی متعلق میں آپ کو ایک بات بتا دوں۔ اس قوم نے آدھی دنیا پر بادشاہی کی ہے۔ یہ انگریزوں کے اوصاف کا کرشمہ تھا۔ انگریز ڈسپلن، کام اور دیانت داری کو اپنا مذہب سمجھتے تھے۔ ان میں انسان شناسی کا وصف خاص طور پر تھا۔ جس ملک پر حکومت کرتے تھے۔ وہاں کے لوگوں کی نفسیات، معاشرت اور مذہب سے گہرائی تک واقفیت حاصل کر لیتے تھے۔ انسان کا چہرہ پڑھ کر اُس کے ساتھ ناپ تول کر بات کرتے تھے میں یہاں تک کہوں گا کہ ہمارے تعلق جو انگریز کو معلوم تھا وہ ہم خود بھی نہیں جانتے تھے۔ اس میجر نے گول کو دیکھا تو وہ اس جنگلی میں دل چسپی لینے لگا۔

وہ شیر کو زندہ پکڑنا چاہتا تھا

میجر پیٹر ہال نے جگوہن کو یہ دلچسپ کہانی سناتے ہوئے کہا ”میں نے گول سے کہا کہ اس شیر کو مدنا ضروری ہو گیا ہے کیونکہ اس نے مولیشیوں پر حملہ کیا تو اسے ایک بچھڑا مل گیا۔ یہ اس کے لیے آسان شکار تھا۔ وہ اب مولیشیوں پر ہی حملے کرتا رہے گا، اور یہ خطرہ بھی ہے کہ مولیشیوں کے ساتھ انسان بھی ہوتے ہیں شیر کیس انسان کے گوشت کو نہ چکھ لے۔ گول نے کہا۔ آپ شیر کے شکار کے لیے آئے ہیں۔ میں آپ کو آگے لے جاؤں گا جہاں آپ شیر کا شکار کھیل سکتے ہیں۔ میں آپ کو ایک تفریح کرانا چاہتا ہوں۔۔۔ ہم شیر کو زندہ پکڑیں گے۔

میں پیجرہ بناؤں گا جو دراصل پھندہ ہوگا....

”میں نے اُسے کہا کہ وہ اپنے ساتھ مجھے بھی مروائے گا اور وہ ایسا مذاق نہ کرے۔ گول نے اُسے بتایا کہ وہ شکار کا اتنا ماہر نہیں جتنی اُسے درندوں اور جانوروں کو پھندوں میں پھانسینے کی مہارت ہے، اور یہ کھیل بڑا ہی دلچسپ ہے۔ اُس نے مجھے بھی بتایا کہ بعض مہاراجے اور نواب مشردوں، ہرنوں، بارہنگوں وغیرہ کے بیچ پالنے کے لئے خریدتے ہیں۔ وہ کئی بچے بیچ چکا ہے اور ایک سرکس کو بھی اُس نے شیر کا ایک بچہ، لنگور اور بندر سیلائی کیے تھے جو حکومت کے افسروں نے اُسے ایک بار ایک جوان شیر کو پٹنے کو کہا تھا جو اُس نے پھندے میں پھانس دیا تھا یہ شاید کسی چڑیا گھر کے لیے تھا....

”میں نے تفریح اور تماشے کے لیے اُسے کہہ دیا کہ اس شیر کو پھانس لے۔ اُس نے اُسی وقت جا کر گاؤں سے کچھ آدمی ساتھ لیے اور اگلے دن دوپہر تک ایک بہت بڑا بانسوں کا پیجرہ تیار کر لیا۔ اس میں کیل نہیں لگائے گئے تھے۔ بانسوں کو سن یا بان کی قسم کی لمبی گھاس سے باندھا گیا تھا۔ گول کہتا تھا کہ اگر گھاس بہت تیز چھڑے سے ہی کٹ سکتی ہے۔ وہ پیجرہ اٹھا کر اور مجھے ساتھ لے کر جنگل میں دو میل اندر چلا گیا۔ بکری کا ایک بچہ بھی اُس نے ساتھ لے لیا تھا۔ اُس نے پیجرہ ایک جگہ رکھوایا اور بکری کے بچے کو اُس کے اندر ایک کونے میں باندھ دیا۔ ایک رسی بانس کی ایک کیل سے باندھی اور سامنے والا دروازہ اوپر اٹھا دیا۔ دروازہ اوپر ہی اٹک گیا۔ اسے بانس کی کیل نے روک لیا تھا۔ گول ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل پیجرے میں گیا جو بنی وہ پیجرے میں داخل ہوا، رسی نے بانس کے

کیل کو پھینچ لیا اور دروازہ گر پڑا۔ پیجرہ بند ہو گیا....

”میں نے دروازہ اٹھایا۔ گول ہنستا ہوا باہر آیا۔ اُس نے دروازے کے نیچے کیل لگا دیا اور بکری کے بچے کو اندر ہی بندھا چھوڑ کر ہم واپس آ گئے۔ گول نے کہا کہ شیر جب بکری کے بچے کو مار چکے گا تو اُسے پتہ چلے گا کہ وہ بند ہو گیا ہے۔ پھر وہ بڑی زور سے گرجے گا۔ ہم ریسٹ ہاؤس کو آنے کی بجائے ادھر ادھر گھومتے پھرتے رہے۔ سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے پیجرہ دیکھنے گئے۔ شیر کی امدادات کو متوقع تھی لیکن ہم نے پیجرے کا دروازہ بند دیکھا۔ پیجرے میں بکری کا بچہ تھا، شیر نہیں تھا۔ گول نے سب سے پہلے زمین دھکی شیر آیا تھا۔ بچوں کے نشان صاف تھے۔ گول نے دروازہ اوپر اٹھایا تو اُسے وہاں شیر کے کچھ بال دکھائی دیے جو اُس نے مجھے بھی دکھائے۔ شیر آیا تھا لیکن پیجرے کے دروازے میں اُس نے قدم رکھا تو اوپر سے دروازہ گر پڑا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کا پاؤں یا منہ کا کوئی حصہ دروازے کے نیچے آیا جو شیر نے باہر پھینچ لیا اور اُس کے کچھ بال دروازے کے نیچے رہ گئے....

”گول نے کہا کہ دروازہ اچھی طرح نہیں اٹکا تھا اس لیے وہ دوسری کوشش کرے گا لیکن میں نے روک دیا اور کہا کہ میں کوئی اور کھیل تلاش نہیں دیکھنا چاہتا۔ میں شیر کے شکار کے لیے آیا ہوں اور میں اسی شیر کو ماروں گا۔ میں نے دیکھا کہ گول کے چہرے کا تاثر بدل گیا۔ وہ شیر کو زندہ کیلنا چاہتا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ وہ اس شیر کو زندہ کیل کر کسی سرکس یا کسی چڑیا گھر کے حوالے کر کے پیسہ کمائے گا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ اپنا کاروبار میرے جانے کے بعد چلا سکتا

ہے، پہلے میرے شکار میں میری مدد کرے۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اُس میں ایک انگریز افسر کی حکم عدولی کی جرأت نہیں تھی۔“

گول کے انسٹرکٹ آئے

جس طرح آج مجھے اس کمائی کی ایک ایک تفصیل یاد آگئی ہے، اسی طرح مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جگہ بن سنگھ نے مجھے یہ کمائی سناتے ہوئے کہا تھا۔ ”انگریز افسر مختصر اور صرف کام کی بات کیا کرتے ہیں لیکن اس انگریز سمیجر نے ہندوستانی عورتوں کی طرح بات اتنی لمبی کر دی کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میرا مزم بھی گول ہے گھوڑا جو اُس کے پاس ہے وہ راجن کے سرکس کا ہے ادرا ب مجھے شک ہونے لگا ہے کہ اس شیر کو گول مارنا نہیں چاہتا تھا بلکہ زندہ پکڑنا چاہتا تھا کیونکہ یہ وہی شیر تھا جو اُس نے خیموں کو آگ لگا کر سرکس کے بیچرے سے نکال دیا ہے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ شیر اُس کے ساتھ کتے کی طرح پیار کرتا تھا۔“

جگہ بن نے مجھے سنایا کہ انگریز سمیجر ایک ہندوستانی سب انسپیکٹر کسے یہ ”بدتمیزی“ برداشت نہ کر سکا۔ اُس نے حاکموں کے لیے میں کہا۔ ”میری پوری بات غور سے سنو۔ تمہارے ڈی۔ ایس۔ پی نے مجھے کہا ہے کہ میں تمہیں پوری بات سناؤں۔ معلوم ہوتا ہے تم میری بات سے اکتا گئے ہو اور اپنی ڈیوٹی میں کوتاہی کر رہے ہو تمہیں شاید احساس نہیں کہ کتنا بڑا جرم سرزد ہو رہا ہے۔

تم ہندوستانیوں کی دل چسپی صرف تنخواہ کے ساتھ ہوتی ہے۔“
جگہ بن سنگھ ایسی ڈانٹ برداشت کرنے والا نہیں تھا۔ اُس نے سمیجر کو کھری کھری سنادیں اور اُسے کہا۔ ”آپ بات پوری سنائیں یا نہ سنائیں میں اپنے مزم کو اس جنگل میں شیروں کی کھچار میں سے بھی نکال کر لے آؤں گا۔“
پھر بھی جگہ بن کو ساری کمائی سننی پڑی جو اُس کے لیے دلچسپ تو بہت تھی لیکن وہ وقت بچانا چاہتا تھا اور اُس کا ارادہ یہ تھا کہ فوراً نوتا نو کو روانہ ہو جائے اور مشیر اس کے گول کمیس روپوش ہو جائے، اُسے گرفتار کر لے۔
کمائی چونکہ دلچسپ تھی اس لیے مجھے بھی آج تک یاد ہے۔ سمیجر بیڑا لے کر جگہ بن کو سنایا:

”رات کو پھر وہی شور سنائی دیا۔ مویشی خوفزدہ ہو کر حلاڑ ہے تھے مگر شیر کی آواز نہ آئی۔ صبح گاؤں کے چند ایک آدمی ریسٹ ہاؤس میں آئے۔ وہ بہت ڈرے ہوئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ شیر کے پیلے حملے سے ڈر کر انہوں نے مویشیوں کے باڑے پر گزشتہ رات ایک آدمی کا پھرہ کھڑا کر دیا تھا۔ رات کو شیر آیا اور اس آدمی کو مار کر چلا گیا۔ میں نے گول سے کہا کہ اس شیر کو فوراً مار دینا ضروری ہو گیا ہے۔ یہ کہہ کر میں اُسے گاؤں میں لے گیا۔ لاش دیکھی۔ وہ ایک جوان آدمی تھا شیر نے اُس کا سر منہ میں لے کر کھل ڈالا تھا۔ اب مجھے یقین ہو گیا کہ شیر انسان نہیں ہے اور اسے انسان کے گوشت کے ساتھ ذرا سی بھی دلچسپی نہیں اور نہ وہ لاش اپنے ساتھ لے جاتا۔ میرا خطرہ صبح ثابت ہوا کہ شیر مویشیوں کو آسان شکار سمجھ کر اسی باڑے میں آیا کرے گا۔۔۔۔“

”میں گول کو ساتھ لے کر سیٹ ہاؤس گیا۔ کھانے پینے کا سامانہ
تھیلوں میں ڈال کر ہم شیر کے تعاقب میں چل پڑے۔ گول شیر کے پنجوں کے نشان
دیکھنے کا ماہر تھا۔ وہ مجھے صبح سمت لے جا رہا تھا۔ نشان مجھے بھی نظر آئے تھے۔
ہم بہت دُور نکل گئے۔ آگے پہاڑی آگئی۔ ہم اس پر جا رہے تھے کہ شیر تقریباً
ایک سو گز دُور جاتا نظر آیا۔ اس کا ایک پہلو ہماری طرف تھا۔ وہ جس طرف جا
رہا تھا وہاں چند قدم آگے گھسی جھاڑی تھی۔ مجھے اپنے نشانے پر بھروسہ تھا میں
نے ایک خطرہ مول لیا۔ راضل کندھے سے لگائی اور گولی چلا دی۔ شیر پوری طرح گرا
نہیں۔ اس کے جسم کا پھیلا ہوا حصہ زمین سے لگا اور شیر دُور کر جھاڑی میں غائب ہو گیا....
”گول نے کہا: صاحب بہادر! اب یہ شیر اور زیادہ خطرناک ہو گیا ہے کیونکہ
زخمی ہو گیا ہے۔ یہی وہ خطرہ ہے جس میں نے مول لیا تھا۔ زخمی شیر بے حد خطرناک ہوتا
ہے۔ زخمی شیر کا تعاقب کر کے اسے مارنا ہی پڑتا ہے۔ اگر اُسے زندہ چھوڑ دیا جائے
تو وہ جس انسان کو دیکھتا ہے اُس پر حملہ کرنا ہے اور بڑا ہولناک انتقام لیتا ہے۔
میں اور گول وہاں گئے جہاں شیر کو میری گولی لگی تھی۔ ہم اب بہت محتاط تھے۔ شیر کا حملہ
کسی بھی لمحے متوقع تھا۔ وہاں خون تھا، شیر نہیں تھا۔ آگے گھسی جھاڑی تھی۔ ہم نے
اس میں پتھر پھینکے اور کان کھڑے کر کے شیر کی آواز سننے کی کوشش کی یہیں کوئی
آواز نہ سنائی دی....

”گول جھاڑی میں سے نگرزا۔ اُس نے مجھے بھی جھاڑی میں جانے سے روک
دیا۔ ہم باہر باہر سے دوسری طرف گئے۔ ہمیں خون اور پنجوں کے نشان نظر آ
گئے۔ گول نے کہا کہ شیر کی پھیلی اور بائیں ٹانگ میں گولی لگی ہے لیکن بڑی نہیں گولی

دور شیر اتنی جلدی غائب نہ ہو جاتا۔ خون زیادہ تھا۔ گولی پٹھے میں سے گذری تھی۔
خون کو دیکھتے ہم بڑھتے چلے گئے لیکن اب ہم بے فکری سے نہیں چل رہے تھے....
”آگے دیا آگیا جس میں پانی کم تھا۔ گول نے مجھے کہا کہ میں کنارے کے ساتھ
آگے بڑھوں اور وہ دوسری طرف سے جائے گا تاکہ شیر کو آگے سے روکا جاسکے۔ میں
گول سے جدا ہو گیا۔ تقریباً ایک میل گئے ہوں گے کہ مجھے ایک سو گز سے زیادہ فاصلے
پر شیر نظر آگیا۔ پہلے کی طرح اب بھی اُس کے کچے جھاڑی تھے۔ اُسے معلوم نہیں کیسے شک
ہو گیا کہ کوئی خطرہ ہے۔ وہ ننگرا آتا ہوا تیزی سے چلنے لگا اور جھاڑی میں داخل ہو گیا۔
ابھی اُس کا آدھا جسم باہر تھا کہ میں نے راضل کندھے سے لگا کر اُس پر گولی چلا دی۔
شیر گرا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ گولی بھی ملک ثابت نہیں ہوئی تھی۔ ایک اور گولی چلی جو
گول نے چلائی تھی۔ میں دوڑ گیا شیر کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ یہ مرتبہ وقت
کی آوازیں تھیں....

”میں جب شیر کے قریب پہنچا تو وہ آخری سانس لے رہا تھا اور گول
اس سے کچھ دُور کھڑا اُسے بالکل ویسے دیکھ رہا تھا جیسے کوئی اپنے کسی عزیز کو مرتے
دیکھتا ہے۔ اُس کے چہرے پر اُسی تھی۔ شاید اُس کی آنکھوں میں آنسو بھی تھے۔
خیر مر گیا تو گول اُس کے پاس بیٹھ کر اُس کے منہ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ مجھے یقین ہو گیا
کہ اُسے شیر کے مرنے کا افسوس ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ تم اسے زندہ پکڑ کر کسی
چڑیا گھر یا کسی کس کو دینا چاہتے تھے۔ تمہارا بہت نقصان ہوا ہے۔ اُس نے
آہستہ سے گردن گھمائی اور مجھے دیکھا لیکن بلا کچھ بھی نہیں....

”میں کل یہاں آیا ہوں۔ شیر کی کھال سرسیت ساتھ لے آیا ہوں۔ تمہارا

ڈی۔ ایس۔ پی میرا گرا دوست ہے۔ میں اس کے ساتھ ایک دن گزارنے کے لیے
 رُک گیا۔ رات کو میں نے اُسے شکار کی یہ داستان سُنائی تو وہ چونک پڑا اور اُس نے
 کہا کہ تم نے غالباً ہماری تفتیش مکمل کر دی ہے۔ اُس نے اُسی وقت تین ٹیلیفون
 کر کے بلایا۔ تم نے میری روئیداد پر بے غور سے سُنی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ میں نے
 تین بہت سے کھونج اور سراخ دے دیے ہیں۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے مجھے کہا کہ
 کہ میں تمہارے ساتھ نوتا نوا جاؤں۔ تین میری راہنمائی کی ضرورت ہوگی۔“

ہندو کی نالی میجر کی طرف کر دی

ڈی۔ ایس۔ پی کی ہدایات کے مطابق میجر پیٹر ہال اور جگہ بن سنگھ یہ سکیم بنا کر
 گول کی گرفتاری کے لیے روانہ ہوئے کہ نوتا نوا کے ریسیٹ ہاؤس میں رات کے وقت
 پہنچیں گے تاکہ وہاں کسی کو پتہ نہ چلے کہ میجر پیٹر ہال کے ساتھ پولیس بھی آئی ہے۔
 کھانے پینے کے انتظام کے لیے میجر پیٹر ہال کا اردی اور پولیس ہیڈ کوارٹر کے
 انتظام کے تحت ایک باورچی پہلے ہی روانہ کر دیئے گئے۔ جگہ بن کے ساتھ
 چار پانچ کاٹیل تھے۔

یہ پارٹی سکیم کے مطابق رات کو وہاں پہنچی جگہ بن اور کاٹیلوں کو چھپ
 کے رہنا تھا۔ رات کو ہی میجر نے گاؤں کے سرکاری آدنی کو بلایا اور اُسے کہا کہ وہ
 گول کو ڈھونڈ کر اُسے کل دن کو یہاں پہنچے کہ وہ آئے۔ میجر نے پیغام کے ساتھ یہ
 بھی کہا بھیجا کہ ایک انگریز کرنل کو شیر کی کھال چاہیے اس لیے میں رات سے واپس

آگیا ہوں۔

گول قریب ہی کہیں مل گیا اور دوسرے دن ریسیٹ ہاؤس میں آگیا۔ وہ
 اُسی گھوڑے پر آیا تھا۔ میجر پیٹر ہال نے اُسے جس کمرے میں ٹھہرایا، اس کے ساتھ والے
 کمرے میں جگہ بن اور کاٹیل موجود تھے جگہ بن نے دروازے کا کاغذ راس کھول رکھا تھا
 تاکہ میجر اور گول کی باتیں سن سکے۔ میجر نے گول کو دھکی پلائی اور اُسے کہا کہ ایک کرنل
 انگلینڈ جا رہا ہے۔ وہ شیر کی کھال اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ وہ اس شیر کی کھال
 لینا چاہتا تھا جو ہم دونوں نے مارا ہے لیکن میں یہ کھال نہیں دینا چاہتا تھا۔ اُس نے
 کہا کہ جاؤ اور ایک اور شیر مار لاؤ۔ وہ میرا دوست ہے۔ میں اسے مایوس نہیں
 کرنا چاہتا۔ میں واپس آگیا ہوں۔

میجر پیٹر ہال فوج کا افسر تھا، پولیس کا نہیں تھا۔ اُس نے یہ احمقانہ حرکت
 کی کہ گول سے ایسے سوال کرنے شروع کر دیے کہ اُسے شک ہو گیا۔ پہلے اُس سے
 پوچھا کہ یہ گھوڑا کہاں سے لیا تھا۔ گول نے گول مول سا جواب دیا تو میجر نے کہا کہ یہ
 کسی سرکس کا گھوڑا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد اُس نے گول سے پوچھا۔ ”مجھے
 یقین ہے کہ جو شیر ہم نے مارا ہے اس کے ساتھ تمہارا کوئی گہرا تعلق تھا۔ تم نے
 پہلے روز اس کے بچوں کے نشان پہچان کر کہا تھا کہ یہ یہاں آگیا ہے۔ کیا بات ہے گول؟“
 گول نے اُسے گول مول جواب دیا جگہ بن سامنے نہیں آسکتا تھا ورنہ
 وہ خود پولیس کے طریقے سے پوچھ گچھ کرتا۔ وہ دوسرے کمرے میں پریشان ہو رہا تھا۔
 میجر نے گول سے پوچھا۔ ”کریم گنج میں راجن کے سرکس کو آگ لگی تھی۔ سنا
 ہے راجن کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق تھا؟“

اس انگریز کی نسبت جنگوں میں رہنے والا گول عقل مند تھا۔ وہ بھانپ گیا کہ یہ صاحب جو کل جا کر آج پھر واپس آگیا، یہ کھال کی خاطر ایک اور شیر کو مارنے نہیں آیا۔ گول پئے پئے ہوئے تھے۔ اُس کے پاس بندوق تھی۔ میجر کی رائفل ابھی بند پڑی تھی۔ گول اٹھ کھڑا ہوا اور اُس۔۔۔ بندوق کی نالی میجر پیڑ ہال کی طرف کر دی۔

”تم مجھے بچانے آئے ہو، گول نے غصے سے کہا۔“ اور کہتے ہو کہ ایک دوست کے لیے شیر کی کھال۔ بے جانی ہے۔ میں اُسے تمہاری کھال دوں گا۔۔۔ یہ گھوڑا راجن کے کرس کا ہے۔ تم اب کریم گنج کی پولیس تک زندہ نہیں پہنچ سکو گے۔“ میجر پیڑ ہال کی آنکھیں پٹھن گئی تھیں۔ اُس کے منہ سے باتیں نکلتی تھیں۔ اب جگموہن سنگھ تماشائی نہیں بنارہ سکتا تھا۔ وہ جس دروازے کے ساتھ کھڑا تھا، وہ گول کے دائیں طرف تھا۔ جگموہن ریوا اور ہاتھ میں لے کر دروازے سے آگے آگیا اور گول کی طرف ریوا اور کر کے بولا۔ ”رائفل بچنے کو گول!“

گول نے جگموہن کی طرف دیکھے بغیر گولی چلا دی۔ جگموہن اُسے ریوا اور کی گولی ہلاک کر سکتا تھا لیکن اُسے زندہ بچنا زیادہ بہتر سمجھا۔ اُدھر گول کی بندوق فائر ہوئی اور دھڑ سے جگموہن نے اُس کے ہاتھ پر ریوا اور فائر کیا۔ فاصلہ بمشکل چار گز تھا۔ گولی گول کے ہاتھ میں سے گز گئی اور اُس کی بندوق گر پڑی۔ کانٹینبل دوڑے آئے اور گول کو چلایا۔

میجر پیڑ ہال کو دیکھا۔ اُس کی موت یقینی تھی کیونکہ گول ماہر نشانہ باز تھا لیکن میجر زندہ تھا۔ کارٹوس کے تھوڑے سے چھترے اُس کے کندھے میں اُس جگہ لگے تھے جہاں تپسلی تنم ہوتی اور بازو شروع ہوتا ہے۔ باقی چھترے ایک طرف نکل گئے تھے۔

میجر کا اردلی اور دوسرا نوکر بھی آگیا تھا۔ میجر نے اپنا بیگ منگوا یا جس میں فسٹ ایڈ کا سامان تھا۔ گول اب بٹنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

میجر پیڑ ہال کے کندھے پر جگموہن نے پٹی باندھ دی۔ خون پوری طرح نہیں رُک رہا تھا۔ گول کے ہاتھ پر بھی پٹی باندھ دی گئی جو کافی نہیں تھی۔ اُس کے ہاتھ میں سے گولی پار ہو گئی تھی۔ دونوں زخمیوں کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ لاری چار میل دُور سے متی تھی۔ میجر پیڑ ہال گول کے مسروقہ گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ باقی سب کے لیے ٹھوٹو منگوائے گئے۔ لاری کے اڈے تک پہنچے۔ وہاں صرف ایک لاری خالص کھڑی تھی۔ لاری مسافرلوں سے بھر جاتی تو چلتی تھی۔ چرنکا امیر جتنی تھی اور لاری ایک انگریز افسر اور پولیس کو درکار تھی، اس لیے وہ سب اس میں سوار ہو گئے اور لاری چل پڑی۔ گھوڑا کریم گنج تک پہنچانے کے لیے ایک کانٹینبل کو اس پر سوار کیا گیا۔

پیار ملا تو درندوں سے ملا

پہلے ڈی۔ ایس۔ پی کے دفتر میں گئے۔ میجر پیڑ ہال کو وہاں کے اسپتال میں داخل کر دیا گیا اور گول کی مرہم پٹی کروا کے ڈی۔ ایس۔ پی نے کہا کہ اسے کریم گنج لے جاؤ اور اس سے بیان لے کر شہادتیں لکھی کر دو اور مقدمہ تیار کر دو۔

کریم گنج لا کر جگموہن نے گول سے کہا کہ وہ اب راجن کے قتل کا اعتراف نہ کرے تو مجھی اُسے ایک انگریز افسر پر گولی چلانے کے جرم میں عمر قید دے کر کالا پانی (جرار انڈیان) بھیج دیا جائے گا۔ ہو سکتا ہے اُسے سزائے موت دے دی جائے۔

پھر کیوں نہ وہ راجن کے قتل کا اعتراف کر لے۔

گول جنگلی تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اس مجرم میں اُسے سزائے موت یا عمر قید نہیں مل سکتی۔ جگموہن نے ڈرایا کہ کالا پانی کی عمر قید بڑی ظالم سزا ہے۔ وہ ہر روز مرے گا اور ہر رات زہر ہوگا۔

”ایسی زندگی سے بہتر یہ ہے کہ قتل کا اقبال کرو اور پھانسی پا کر ایک ہی بار مر جاؤ۔“ جگموہن نے اُسے کہا۔ ”تم حبسیا دلیر اور غیرت مند آدمی عمر قید نہیں کاٹ سکے گا۔ اگر تم کا کالا پانی جا کر سمیڑ گئے تو تمہیں مرنے کے لیے جنگل میں پھینک دیا جائے گا یا سمندر میں پھینک دیں گے جہاں تمہیں مچھلیاں کھائیں گی۔“

اس طرح جگموہن نے اُسے بالکل غلط اور بڑی ہی ڈراؤنی باتیں سنا سنا کر اس

قدر دہشت زدہ کر دیا کہ گول نے بے اختیار کہا۔ ”مجھے پھانسی کی سزا دلادو۔“

پھر اُس نے جگموہن سے موت کی کڑے سے شراب منگوادے۔ گول پتیا بہت تھا۔

جگموہن نے شراب کی بوتل منگوائی اور گول نے اقبالی بیان دینا شروع کر دیا۔

”مجھے بالکل یاد نہیں کہ میرا باپ کون تھا اور ماں کون تھی۔“ اُس نے کہا۔

”ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے جنگل کے جانوروں اور درندوں کے ساتھ بل کر جوان ہوا

ہوں۔ آپ کو اس سے تو کوئی غرض نہیں ہوگی کہ میں کہاں سے آیا ہوں۔ دس باہال

کی عمر میں اسی جنگل میں فوتا تو اسے چالیس میل دور ایک جنگلے میں پکچھا بلانے کے

لیے نوکر بھرا تھا۔“

اُس زمانے میں بجلی نہیں ہوتی تھی۔ چھت کے ساتھ بہت بڑے پکچھے لٹکا

دیے جاتے تھے۔ لکڑی کا دو تین گز لمبا فریم ہوتا تھا۔ اس پر کپڑا چڑھا ہوتا تھا

اور اس کے نیچے درمی کی طرح کا فریم جتنا لمبا اور نصف یا پون گز چوڑا کپڑا لٹکا رہا ہوتا تھا۔ لکڑی کے فریم کے ساتھ لمبی رتی ہوتی تھی جو دروازے تک جاتی تھی ایک نوکر سارا دن اس رتی سے پکھا ہلاتا رہتا اور صاحب لوگ اور امیر کیر لوگ پکچھے کے نیچے آگام سے سوتے رہتے تھے۔ انگریز ان ملازموں کو پکچھا بوائے کہا کرتے تھے۔

”خدا نے مجھے دماغ بھی اچھا دیا تھا۔ شکل بھی اچھی دی تھی اور جسم کو سختیاں

سنسنے کی طاقت اور صبر دیا تھا۔“ گول نے اپنے بیان میں کہا۔ ”مجھے پیار اور

محبت کی بھی ضرورت تھی، ردی اور کپڑے کی بھی ضرورت تھی۔ میں نے یہ سب

ضرورتیں چالاکی اور ہوشیاری سے پوری کرنے کا ڈھنگ کچن میں ہی سیکھ لیا تھا۔

چودہ پندرہ سال کی عمر میں ایک انگریز شکاری کی مہربانی سے مجھے پہلے شیر کے

شکار پر اُس کا سامان اٹھا کر لے جانے کا موقع ملا۔ اس کے بعد میں نے اسی کام

میں مہارت حاصل کر لی اور اسی عمر میں ایک ایسے استاد کی شاکردی کر لی جو جنگل کا پورا

تھا۔ وہ پھندے لگا کر ہرنوں اور بارہ سنگول اور شیروں کو پکڑتا، انہیں زہر دے

کر مارتا اور اُن کی کھالیں اُتار کر شہروں میں بیچ آتا تھا۔ یہ بہت بڑا جرم تھا۔

”میں نے استاد کو اس طرح خوش کیا تھا کہ نیپال کے جنگل کی ایک بہت ہی

خصوصورت لڑکی کو جس کی عمر سولہ سترہ سال تھی، وغلا کر گھر سے نکالا اور اُسے

استاد کے حوالے کر دیا تھا۔ استاد نے مجھے اپنے پیشے کے سارے داؤ بیچ سکھا

دیے۔ میں جرم بھی کرتا رہا اور جو انگریز اور جو راجے ہمارے شکار کھینٹے آتے تھے،

کے ساتھ بھی اجرت اور انعام پر جاتا رہا۔ اسی دوران میں نے رافل اور

سردق چلانی سیکھی۔ جنگل کے ایک گاؤں کے نمبردار نے مجھے اپنا پہرہ دار بنالیا۔

اُس کی دد بویاں تھیں۔ وہ جنگل کا بادشاہ تھا۔ اُس کی ایک بوی جوان تھی۔ وہ مجھ پر ملان ہو گئی۔ میں جتنا عرصہ وہاں رہا، منبر دار اس راز سے واقف نہ ہو سکا۔ منبر دار کے ساتھ مل کر بھی میں نے بہت جُرم کیے۔۔۔

”میرے دل میں درندوں کا پیار پیدا ہو گیا۔ میں شیروں اور بھیڑیوں کے بچے اٹھاتا تھا اور انہیں بڑے پیار سے اپنے ساتھ مانوس کر لیتا تھا۔ میں نے نشادی کی کھچی سوچی ہی نہیں۔۔۔ چند اور سال گزرے تو میں جنگل کا استاد بن گیا اور اب مجھے کسی کے سائے اور سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں ماہر شکاری اور انگریز شکاریوں کا مددگار بن گیا۔ جنگل کے سرکاری کازندوں اور ٹھیکیداروں سے بھی میری دوستی ہو گئی۔ میں سرکسوں اور چڑیا گھروں کو شیر وغیرہ سپلائی کرتا رہا۔ نوابوں اور مہاراجوں کی فرمائش کے پرندے اور جانوروں کے بچے انہیں دے کر بہت پیسہ کیا۔ یہ پیسہ شراب پر اور من پسند عورتوں پر خرچ ہوتا رہا۔۔۔

رقم لڑکی کو دے دی اور...

”راجن سے اس سلسلے میں پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اُسے میں نے لنگر دیا۔ بندر دیے۔ میں بچے چوری کیا کرتا اور انہیں اپنے پاس رکھا کرتا تھا اس لیے یہ میرے ساتھ مانوس ہو جاتے تھے۔ میں انہیں جو حرکتیں سکھاتا وہ کرنے لگتے تھے۔ اس طرح مجھے جانوروں کو سدھانے کا تجربہ ہو گیا۔ راجن میں یہ غرابی تھی کہ پیسے ترسا ترسا کر دیتا تھا اور اکثر پیسے ہضم کر جاتا تھا۔ اُس کی مجھے یہ بات پسند

تھی کہ ولانتی شراب پلاتا تھا اور میرے ساتھ محبت بہت کرتا تھا۔۔۔

”میں نے اُسے شیر کا ایک بچہ لاکر دیا۔ اُس نے پیسے جلدی دینے کا وعدہ کیا تھا مگر اُس نے ٹرخانا شروع کر دیا۔ بچے کو میں نے تین چار مہینے اپنے پاس رکھا تھا اس لیے وہ میرے سوا کسی اور کو قریب نہیں آنے دیتا تھا۔ راجن نے کہا کہ اسے میں ہی سدھاؤں۔ میں نے ایک سال سرکس کے ساتھ رہ کر شیر کو سدھایا اور یہ تماشا دکھانے لگا۔ راجن نے مجھے ولانتی شراب، اچھے سے اچھا کھانا اور الگ خیمہ دیا، پیسہ ایک بھی نہ دیا۔ دوستی اور پیار محبت میں ٹرخاتا رہا۔۔۔

”ایک رات میں نے شراب پی ہوئی تھی۔ میں راجن کے خیمے سے اپنے خیمے کو جا رہا تھا۔ سرکس کی ایک لڑکی سامنے آ گئی۔ میں انسان تو ہوں نہیں۔ میں جنگل کے جانوروں اور درندوں میں جنایا ہوں۔ میں لڑکی کو بازوؤں پر اٹھا کر اپنے خیمے میں لے گیا۔ وہ شور مچا رہی تھی۔ سرکس کے آدمی آگئے اور لڑکی کو چھڑا کر بے گئے۔ راجن کو پتہ چلا تو وہ دڑا آیا۔ اُس نے مجھے گالیاں دیں۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ مجھے شیر کی قیمت اور اسے سدھانے کی اجرت دے دے، میں چلا جاؤں گا۔ اُس نے مجھے تھوڑے سے پیسے دیے اور کہا کہ ایک مہینے بعد آکر رقم لے جانا۔۔۔

”میں سرکس سے چلا گیا اور کھچی کھجا آتا رہا۔ اس شیر کے ساتھ میری دوستی گہری ہو گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ کتوں جیسی حرکتیں کرتا تھا۔ ایک بار میں نے اُسے بیخبر سے سے نکال لیا اور وہ میرے پاؤں میں لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ جوان شیر کو باہر نکالنا خطرناک تھا لیکن شیر میری محبت میں بھول ہی گیا تھا کہ وہ شیر ہے۔ راجن نے بہت جلد دیے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ میری رقم ہضم کرنا چاہتا ہے۔ میں نے

ارادہ کیا تھا کہ اس رقم کو بھول جاؤں گا لیکن مجھے رقم کی ضرورت تھی اور ضرورت یہ تھی کہ ایک گاؤں میں ایک بڑی خوبصورت لڑکی جوان ہو گئی تھی، لیکن اس کے ماں باپ اتنے غریب تھے کہ اس کی شادی کے لیے ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا....

”میں کہاں کا شریف آدمی تھا لیکن ایک روز اس لڑکی کا باپ مجھے ملا۔ اُس نے میرے آگے ہاتھ جوڑ کر اور رو کر کہا کہ گوئل، کچھ قرض ہی دے دو۔ لڑکی کی شادی نہ ہوئی تو ایک بد معاش اُسے پریشان کر رہا ہے جس کا ہم کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ میں نے اُسے کہا کہ تمہاری لڑکی کی شادی میں کراؤں گا۔ میں نے سب سے پہلے اس بد معاش کو کڑا اور اُسے مار مار کر بے ہوش کر دیا۔ اُس وقت سارے جنگل میں میری دھاک مٹیٹی ہوئی تھی۔ میں نے لڑکی کے باپ سے کہا کہ میں اُسے رقم لا دوں گا....“

”رقم راجن کے پاس تھی۔ اُس کا سرس کریم گنج آپکا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اس سرس کا سٹراخ لگایا تھا۔ راجن سے کہا کہ اب مجھے پوری رقم کی ضرورت ہے۔ وہ پھر ٹھانے لگا۔ اُس نے مجھے ولایتی شراب پلائی۔ میں نے اُسے کہا کہ تم کمرہ کر میرے پاس پیسے نہیں ہیں، میں تمہیں رقم معاف کر دوں گا۔ وہ مجھے ملتا رہا۔ مجھے غصہ آ گیا۔ ایک وہ غریب لڑکی ہے جس کی شادی نہیں ہو سکتی کہ اُس کے ماں باپ کے پاس پیسے نہیں، اور ایک یہ آدمی ہے جس کے پاس روپوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں اور وہ پھر بھی دوسروں کا حق مار رہا ہے....“

”میں نے اُسے غصے سے کہا کہ میں آج رقم لے کر جاؤں گا۔ اُس نے مجھ سے زیادہ غصے سے کہا کہ جا، جنگلی! ایک پیسہ نہیں دوں گا۔ مجھے دھونس دکھاتے

ہو؟... میں اُس کے خیمے سے نکل آیا لیکن قریب ہی ویرانے میں گھومتا پھرتا رہا۔ آدھی رات تو ہو چکی تھی۔ جب دیکھا کہ سرس کے لوگ تھکے ہوئے گہری نیند سو گئے ہیں اور بتیاں بچھ چکی ہیں تو واپس آ گیا چوری چھپے راجن کے خیمے میں داخل ہو گیا۔ اُس کے لیپ کی بتی بدھ تھی۔ میں نے سب سے پہلے اُسی کا رد مال اُس کے منہ میں ٹھونس دیا۔ اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اُس کی آواز نہیں نکل سکتی تھی۔ وہ اُٹھا۔ میں نے اُس کا بازو مڑ کر اُسے فرش پر اوندھے منہ گرا لیا۔ آپ میرا جسم دیکھ رہے ہیں۔ اس جسم میں بہت طاقت ہے....“

”میں پورا انتظام کر کے آیا تھا۔ میرے پاس رسی تھی۔ میں نے اُس کی پیٹھ پر اپنے گھٹنے دبا کر اُس کے ہاتھ پیٹھ پر رسی سے باندھ دیے۔ پھر اُس کے پاؤں بھی رسی سے باندھے۔ اُس کا لیپ بڑا تھا۔ میں نے اس کا ڈھکن کھول کر تیل راجن پر چھڑک دیا۔ خیمے پر بھی تیل چھڑکنا تھا لیکن لیپ شام سے جل رہا تھا، اس میں تیل کم رہ گیا تھا۔ میں نے راجن کا لباس کھولا۔ اس میں شراب کی دو بوتلیں تھیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ شراب تیل کی طرح آگ پکڑتی ہے۔ میں نے کبس کی تلاشی لی۔ اس میں بہت رقم پڑی تھی۔ راجن کو اتنا یقین تھا کہ اُس کے خیمے میں چوری نہیں ہو سکتی کہ اُس نے تجس کو تالا نہیں لگایا تھا، یا شاید شراب کے نشے میں وہ تالا لگانا بھول گیا تھا....“

”میں نے شراب کی ددوں بوتلیں نکال لیں۔ رقم میں کئے زیادہ تھے۔ میں نے پانچ اور دس روپے کے جتنے نوٹ تھے، نکال کر اپنی کمر کے ساتھ باندھ لیے۔ شراب کی بوتلیں کھولیں اور شراب خیموں کے اندر دنی کپڑے پر چھڑک دی۔

چار پائی اور میز پر بھی چھڑکی۔ ماچس جلا کر پیسے راجن کے کپڑوں کو آگ لگائی۔ اس کے ساتھ ہی جھک ہوئی اور سارے خیمے کو آگ لگ گئی۔ یہ شراب کی وجہ سے آگ لگی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسے ہوگا۔ میں فوراً باہر نکل گیا۔ میرے ہاتھ میں شراب کی ابھی ایک بوتل تھی۔ اسے کھول کر میں نے ذرا پرے ایک اور خیمے پر شراب چھڑکی اور آگ لگا دی اور میں سکرس کے بڑے خیمے کے پیچھے چلا گیا....

”ہوا بہت تیز تھی۔ آگ فوراً پھیل گئی اور سکرس کے لوگ جاگ اٹھے۔ ایسی ہڑ بولنگ اور افراتفری مچی کہ کسی کو کسی کا ہوش اور خیال نہ رہا۔ جھکڑ تھی۔ آگ پر پانی پھینکنے کی بجائے لوگ ادھر ادھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔ مجھے امینین تھی کہ آگ اس طرح پھیلے گی۔ میری نظر اس گھوڑے پر تھی۔ میں اُس طرف چلا گیا جہاں جانور بندھے ہوئے تھے۔ میں نے بڑے آرام سے گھوڑے کے پاؤں کا پٹہ کھولا اور اُس طرف نکل گیا جدھر اندھیرا تھا۔ میں محفوظ فاصلہ پر پہنچ گیا تو مجھے شیردوں کی گرج سنائی دی۔ مجھے اپنے شیر کا خیال آ گیا۔ میں سمجھا کہ آگ شیردوں اور جیتوں کے پجروں تک پہنچ گئی ہے اور ان کے ڈر سے کوئی اُن کے پیچھے کھولنے کی جرأت نہیں کرے گا اور یہ درندے زندہ جل جائیں گے....

”میں نے گھوڑا ایک درخت کے ساتھ باندھا اور سکرس کی طرف دوڑ پڑا۔ اب سکرس کے آدمی تالاب سے پانی لا رہے تھے۔ میری واردات ہر طرح کا میاب ہو رہی تھی۔ جہاں پیچھے تھے وہاں اندھیرا تھا۔ آگ دودھ تھی اور آگ اور پجروں کے درمیان سکرس کا بڑا خیمہ تھا جو بہت وسیع اور گول ہوتا ہے۔

لوگ پانی دوسری طرف سے لا رہے تھے۔ میں اپنے شیر کے پیچھے کے اوپر جا کر اس کا دروازہ کھولنے کی بجائے اُس کے سامنے چلا گیا اور آہستہ سے آواز دی۔ ”ہمارا۔۔۔ میرے شیر کا نام تارا تھا۔ اُس نے میری آواز پہچان لی۔ میں نے پیچھے کا دروازہ اٹھایا اور شیر کے منہ پر ہاتھ پھیرا۔ وہ باہر کود آیا۔ میں نے اُسے زندہ سے بچا لیا تھا....

”میں گھوڑے تک گیا اور اُس کی منگی بیٹھ پر سوار ہو گیا۔ شیر ساتھ تھا۔ کوئی جانور شیر کے قریب نہیں ٹھہر سکتا۔ گھوڑے تو شیر کی ٹوپا کر سر پٹ دوڑ پڑتے ہیں لیکن یہ گھوڑا شیردوں کی بُور اُن کی دن رات کی گرج اور دھاڑ کا عادی تھا اس لیے نہ ڈرا....

”میں صبح سے پہلے اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا جو گھنے جنگل میں تھا شیر میرے جھونپڑے کے باہر گھومتا پھرتا رہتا تھا۔ اپنا شکار مار کر کھاتا تھا۔ دو تین دنوں بعد شیر کہیں نکل جاتا تھا۔ میں گھوڑے پر بیٹھا اور وہ تمام رقم جو راجن کے سکرس سے نکالی تھی اُس لڑکی کے باپ کو جادی جس کی شادی غربت کی وجہ سے رکی ہوئی تھی۔ شیر نے کوئی ایک مہینہ میرا ساتھ دیا۔ ایک رات اُسے ایک شیرنی کی آواز سنائی دی۔ میں اس آواز کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ شیرنی کسی شیر کو لپکا رہی تھی۔ تارا اس آواز پر دوڑ پڑا۔ اس کے بعد میں نے اُسے اُس وقت دیکھا جب یہ انگریز (اسر) بچر پٹر مال اشکار کے لیے گیا تھا....

”میرا شیر جوان ہو گیا تھا اور اس کی جوانی تنہائی میں گزر رہی تھی۔ آپ شاید حیران ہو رہے ہوں گے کہ ایک شیر ایک انسان کے ساتھ کتنے کی طرح پیار کرتا تھا۔

ملا تھا۔ دوسرے دن اس شیر نے ایک اور آدمی کو مار ڈالا لیکن اُسے کھایا نہیں۔ وہ بد قسمت آدمی اُس کے شکار کے آگے آگیا ہوگا۔ انگریز شکاری نے کہا کہ وہ اسی شیر کو مارے گا۔ دراصل شیر وہاں سے چار پانچ میل دُور تھے۔ میرا شیر اس علاقے میں اکیلا آگیا تھا...

”اس کے دن پورے ہو گئے۔ ہم نے اس کا تعاقب کیا تو صاحب نے اناٹیوں کی طرح گولی چلا کر اسے زخمی کر دیا۔ اس سے یہ شیر بہت خطرناک ہو گیا تھا۔ ایک جگہ پھر شیر نظر آیا تو صاحب نے پھر گولی چلا دی۔ میں دوسری طرف تھا جہاں سے مجھے شیر اچھی طرح نظر آ رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ شیر کو دوسری گولی نے بھی صرف زخمی کیا ہے اور یہ زخم اُسے تڑپا تڑپا کر دو تین روز بعد مار گئے تو میں نے اس کے پیلو پر گولی ماری تاکہ گولی اُس کے دل میں اُتر کر اسے فوراً ختم کر دے۔ میں نے اپنے شیر کو اذیت کی موت سے بچا لیا۔ مجھے بہت صدمہ ہوا۔ صاحب اس کی کھال لے کر چلا گیا تو میں اکیلے جا کر بہت رویا....

”اس شکاری کے جانے کے دو ہی روز بعد مجھے پھر نوٹاؤا کے ڈاک بنگلے میں بلایا گیا تو میں نے دیکھا کہ یہ تو وہی صاحب ہے جو کل پرسوں یہاں سے گیا ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ اُس نے میرے ساتھ کیا باتیں کی تھیں۔ مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہو گیا کہ کس کے گھوڑے نے جو میرے پاس تھا میرا راز افاش کر دیا ہے اور یہ صاحب جاسوسی کرنے آیا ہے۔ میں بچہ یا اناٹی نہیں تھا۔ اُس نے سوال ہی ایسے پوچھے کہ میں بھانپ گیا کہ یہ کیوں آیا ہے۔ اگر مجھے ذرا سا بھی اشارہ مل جاتا کہ ڈاک بنگلے میں پولیس بھی موجود ہے تو میں فرار ہو جاتا پھر دیکھتا کہ کون مجھے

میں جنگل کے جانوروں اور درندوں کی فطرت سے واقف ہوں۔ یہ شیر جب چند دنوں کا بچہ تھا تو اسے میں اٹھالایا تھا اسے میں اپنے ساتھ سلاتا اور دُودھ پلاتا تھا۔ کس میں لے جا کر میں ایک سال سے زیادہ عرصہ اس کے ساتھ رہا اور اسے انسانی بچوں کی طرح گود میں اٹھاتا، کھلاتا پلاتا اور کرتب سکھاتا رہا۔ پھر بڑا ہوا تو اس کا واسطہ انسانوں کے ساتھ رہا اس لیے یہ انسان کو اپنا دشمن یا اپنا شکار نہیں سمجھتا تھا، مگر شیرنی کی ایک خاص آواز نے اسے جنگل کا شیر بنا دیا اور مجھ سے جدا ہو گیا....

”تقریباً دو مہینے بعد مجھے زناؤا کے ڈاک بنگلے میں اس انگریز افسر کو شکار میں مدد اور راہنمائی دینے کے لیے بلایا گیا۔ ظاہری طور پر یہی میرا پیشہ تھا میں وہاں گیا تو پتہ چلا کہ ایک شیر نے رات کو موشیوں کے باڑے پر حملہ کیا ہے۔ میں نے جا کر زمین پر شیر کے پگ (بچوں کے نشان) دیکھے تو میں نے اپنے شیر تارا کو پہچان لیا۔ اس کے پگ تو میں کبھی بھول ہی نہیں سکتا۔ میں درندوں کے پگ پہچاننے کا ماہر ہوں۔ ”میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ شیر مارا جائے۔ میں نے صاحب سے کہا کہ اسے زندہ پکڑ کر اپنے پاس رکھنے کی کوشش کروں گا ورنہ اگر یہ میرے پاس رہ گیا تو کسی ڈوا یا مارا جے کو دے آؤں گا۔ بڑی اچھی قیمت مل سکتی تھی، لیکن شیر بیچنے میں یہی پھندے میں نہ آیا....

”میں نے یہ بھی کوشش کی کہ اس انگریز شکاری کو جنگل کے کس دوسرے جتنے میں لے جاؤں اور وہ کوئی اور شیر مارے لیکن ایسا ممکن نہیں تھا کیونکہ جنگل کے ہر ایک میں تقسیم ہے اور اس انگریز کو صرف اس ہلاک کا اور صرف ایک شیر مارنے کا لاشنس

اس جنگل میں ڈھونڈتا ہے۔ میں ڈھونڈنے والوں کو ایک ایک کر کے گولے کا نشانہ بنا دیتا....

”مجھے اس صاحب پر غصہ آگیا۔ میں سمجھا وہ اکیلا ہے۔ مجھے اس پر اس لیے بھی غصہ آیا تھا کہ اس نے میرے شیر کو اس طرح زخمی کیا تھا کہ شیر میرے ہاتھوں مر رہا میں اس انگریز کو گولی مار کر بھاگ جانے کے ارادے سے اٹھا تھا۔ میں نے اس کے سر کا نشانہ لیا تھا تاکہ اس کا منہ اڑ جائے مگر آپ نے مجھے اُس وقت لٹکا کر جب میں گولی چلانے لگا تھا۔ آپ کی آواز سے میرا نشانہ چوک گیا۔ میں آپ کو بھی گولی مارنا چاہتا تھا لیکن آپ نے اس سے پہلے ہی میرے ہاتھ پر گولی چلا دی۔“

جگمگہن سنگھ نے اس کا قبالی بیان ایک مجبوری سے قلمبند کر دیا۔ گول نے عدالت میں بھی اقبالِ محرم کیا اور اُسے سزائے موت دے دی گئی۔



جہاں راتیں جاگتی اور دن سوتے ہیں

بارات کے ساتھ مجھے بھی جانا پڑا۔ میں خوش تھا کہ بہت عرصے بعد تیش اور تھانے سے نجات ملی۔ اعصاب تھکے ہوئے تھے۔ دماغ ڈکھ رہا تھا۔ یہ بارات میرے لیے دوا کا اثر کھتی تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ جہاں بارات جا رہی ہے وہاں رات کو توالی ہوگی اور دق کی ایک گانے والی کا بجز ابھی ہوگا۔ میں تو فرغت کو ترس رہا تھا مگر بارات کے ساتھ دھن کے گھر پہنچے تو ایک کی بجائے دو قتل ہو گئے۔ توالی اور بجز اصرارہ گیا اور ساری رات قاتلوں کے پیچھے دوڑتے گزر گئی۔ وہ تھکا نہ میرا نہیں تھا لیکن مجھے تیش اور تعاقب میں پورا پورا ساتھ دینا پڑا۔

بارات ایک مسلمان جاگیر دار کے بیٹے کی تھی۔ یہ جاگیر دار انگریزوں کا پڑوہ تھا۔ اس کے دو بیٹے فوج میں تھے۔ ایک کیپٹن دوسرا لیفٹیننٹ۔ وہ جہاں کارہننے والا تھا، میں وہاں کے تھانے کا ایس۔ ایچ۔ اورہ چکا تھا۔ اس دوران اس جاگیر دار کے ساتھ گھرے دوستانہ مراسم پیدا ہو گئے تھے۔ اب میں تیس میل دور ایک تھانے میں چلا گیا تھا۔ جاگیر دار نے ایک آدمی کے ذریعے

پیغام بھیجا کہ میں بارات کے ساتھ ضرور چلوں۔ ایک تو دوستی ایسی تھی کہ میں ٹال نہ سکا اور ٹال نہ سکے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ مجھے تفریح اور ذرا سی فرحت کی ضرورت تھی۔

میں اُس کے ہاں چلا گیا۔ اُس کے جس بیٹے کی شادی ہو رہی تھی وہ اوباش اور عیاش نوجوان تھا۔ اُس کا نام تو کچھ اور تھا، میں اُسے دولہا ہی کہوں گا۔ وہ شادی سے پہلے ہی دولہا ہی بنا رہتا تھا۔ میں اُس کے باپ سے کہا کرتا تھا کہ اسے بھی فرح میں کمیشن دلا دو یا اس کی شادی کر دو۔ وہ اکثر دلی جاتا رہتا تھا۔ وہ صرف عیش و عشرت کے لیے جاتا تھا۔ اُس کے باپ کے پاس زمین اور دولت کا کچھ حساب نہ تھا۔ وہ میری بات نہ سمجھ سکا۔ ہم جسے شہزادہ کہا کرتے ہیں اسے ہندو راجکار کہتے ہیں۔ باپ اپنے بیٹے کو بڑے فخر سے راجکار کہا کرتا تھا۔ راجکار مہاراجوں کے ان بیٹوں کو کہا کرتے تھے جنہیں مہاراجوں کا جانشین بننا ہوتا تھا۔ اس مسلمان جاگیردار پر چونکہ انگریزوں اور ہندوؤں کا اثر زیادہ تھا، اس لیے وہ بیٹے کو شہزادہ کی بجائے راجکار کہتا تھا۔

باپ کو آخر خیال آگیا۔ اُس نے اپنے راجکار کے لیے اپنے جیسے ایک جاگیردار کی بیٹی کے ساتھ رشتہ طے کر لیا۔ لڑکی والے چالیس میل دور رہتے تھے۔ وہ بھی گاؤں تھا اور اُس گاؤں پر لڑکی کے باپ کی عمرانی تھی۔ وہ بھی انگریزوں کا منظور نظر تھا۔ بارات کرات وہیں ٹھہرنا تھا۔ آج کل بارات کو فوراً چھٹی دے دی جاتی ہے۔ رات رکھنے کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔

اُس زمانے میں بارات کرات نہ رکھنا اپنی اور لڑکے والوں کی توہین سمجھا جاتا تھا۔ یہ لوگ تو روپے پیسے والے تھے۔ بارات کو کئی راتیں رکھ سکتے تھے۔ بارات پانچ بسوں پر گئی۔ بسوں کی بچتوں پر بھی بارا قی سوار تھے۔ اُس دور میں بسوں کی یہ افراط نہیں تھی جو آج ہے۔ چونکہ جاگیردار دولت مند تھا اس لیے اُس نے دلی سے بسوں کا انتظام کر لیا تھا۔ لڑکی والوں کے گاؤں پہنچے تو سارا گاؤں دھن بنا ہوا تھا۔ میں نے اتنی رونق شاید ہی کسی شادی پر دیکھی ہوگی۔ دونوں فریق دولت اور جاگیرداری کی خوب نمائش کر رہے تھے عجیب چیزیں دیکھی کہ لڑکی والوں نے قوالی اور مہرے کا انتظام کر رکھا تھا۔ بھانڈوں اور ٹٹوں کے تماشے کا بھی اہتمام تھا۔

ایک گیت و غزلیں اور قتل

نکاح ہو گیا۔ بھانڈوں اور ٹٹوں نے خوب رونق پیدا کی۔ قوال آچکے تھے۔ گانے والی شام سے ذرا پہلے آئی۔ وہ دلی کے حمیری گیٹ کی دنیا کی باسی تھی۔ یہ طوائفوں کا بازار تھا جہاں ناچنے اور گانے والیاں بھی اپنا کاروبار کرتی تھیں۔ ان میں اونچے درجے کی بھی ہوتی تھیں، درمیانہ درجے کی اور بالکل تھرڈ کلاس بھی ہوتی تھیں جنہیں لوگ بیاہ شادیوں پر لے جایا کرتے تھے۔ قمر بانئ درمیانہ درجے کی ایک گنام سی گانے والی تھی۔ وہ جوانی کی عمر میں تھی اور بہت خوبصورت تھی۔ اُس کے جسم میں عجیب سی کشش تھی۔ جو کمرہ

جاتی تھی، وہ ناز و انداز اور سکراہٹ سے پوری کر لیتی تھی۔

میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے لڑکی کے باپ کو چونکتے اور گھبرا کر اٹھتے دیکھا۔ اُس نے دولہا کے باپ کے کان میں کچھ کہا۔ وہ بھی گھبرا کر اٹھا اور مہمانوں کو دیکھا۔ اُس کی نظر مجھ پر پڑی تو دوڑا آیا۔

”ملک صاحب!“ اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”قربانی قتل ہو گئی ہے۔“

میرا ذہن محفل موسیقی سے اُچھل کر تھانے جا پہنچا جیسے تھانے میں کوئی مجھے قتل کی رپورٹ دے رہا ہو۔ مجھے طینان صرف اتنا ہوا کہ وہ تھانہ میرا نہیں تھا اور یہ کیس بھی میرا نہیں تھا لیکن تھانہ دار ہوتے ہوئے میں اس سے لا تعلق نہیں رہ سکتا تھا۔ اس تھانے کا اسی۔ ایچ۔ او ایک ہسندو سب انسپکٹر ایشیہ نندہ تھا۔ خوبصورت جوان اور بہت قابل پولیس آفیسر تھا۔ دماغ کا تیز اور جسم کا پھرتیلا تھا۔ وہ اُن آدمیوں میں سے تھا جو آج کا کام کل پر ملتوی کرنے کی بجائے کل کا کام بھی آج ہی کر لیا کرتے ہیں۔ بڑے امیر ماں باپ کا بیٹا تھا اس لیے اُس میں لاپرواہی کم تھا۔ اُس نے رشوت کا رٹ اتنا اونچا مقرر کر رکھا تھا کہ ہر کوئی اُس سے اپنا کام نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کا مطالبہ کوئی جاگیر دار یا ٹھیکیدار ہی پورا کر سکتا تھا۔

راجیش لڑکی والوں کی طرف سے مدعو تھا۔ وہ عام ہندوؤں سے مختلف آدمی تھا۔ اُس نے کھانا ہمارے ساتھ کھایا اور بڑے مزے سے گوشت کھاتا رہا تھا۔ وہ تنگ نظر نہیں تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھا تھا۔ دولہا کے باپ نے مجھے کہا کہ قربانی قتل ہو گئی ہے تو راجیش مجھ سے

میں اُسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ واقعی حسن کا شاہکار تھی۔ میرا خیال تھا کہ اُس کا گانا بھی اُس کے حسن و جوانی جیسا ہوگا، مگر مجھے مایوسی ہوئی۔ اُس نے ایک گیت اور دو غزلیں سنائیں۔ اُس کی آواز واجبی سی تھی۔ لوگوں نے اُس پر روپوں کا مینہ برسا دیا۔ یہ ولیس دکھا دے کے لیے دی جا رہی تھیں جیسا کہ آپ اکثر شادیوں میں دیکھا کرتے ہیں... دولہا تھوڑی تھوڑی دیر بعد پانچ روپے کا نوٹ لکالتا ہوا میں لہراتا اور قربانی نازک سے پودے کی ڈالی کی طرح جھومتی لہراتی آتی اور طلسماتی سی سکراہٹ سے نوٹ لے کر چلی جاتی۔ دولہا کا باپ اور اُس کا باپ بھی اسی طرح نوٹ پر نوٹ پھینک رہے تھے۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ اُس دور کا پانچ روپے کا نوٹ آج کے سو روپے کے برابر تھا۔

قربانی کی نانگہ نے (جو گانے والیوں کے ساتھ ہوا کرتی ہے) کہا کہ قربانی ذرا آرام کر لیں۔ گاتے گاتے اور اٹھا اٹھ کر وہیں وصول ہو کر کے تھک گئی ہیں۔ چنانچہ طے ہوا کہ قربانی شروع کر دی جائے اور اس کے بعد قربانی گانا سنائے گی اور قص بھی کرے گی۔

قربانی اپنی نانگہ اور سازندوں کے ساتھ محفل سے اُٹھ کر چلی گئی اُس کے لیے الگ کمرے کا انتظام کیا گیا تھا۔ قوالوں نے محفل جمائی۔ میں نے دیکھا کہ قربانی کی نانگہ اور سازندے قوالی سننے کے لیے آگئے۔ قوالی بھی شروع ہوئی تھی کہ ایک آدمی نے لڑکی کے باپ کے کان میں کچھ کہا۔ اتفاق سے،

پہلے اٹھا اور پوچھا۔ ”کہاں؟“
”کمرے میں۔“

تحصیلدار بھی مارا گیا

قوالی روک دی گئی۔ لڑائی اور لڑکے کے باپ حویلی کی طرف دوڑے۔
میں اور راجیش اُن کے ساتھ گئے۔ دولہا بھی اُٹھ دوڑا۔ ذرا سی دیر میں
ہڑو بگ بگ گئی۔ دھماکے کی طرح خبر لوگوں میں پھیل گئی کہ گانے والی قتل ہو گئی
ہے۔ وہاں لوگ تھوڑے نہیں تھے۔ دُور دُور سے تماشا ئی آئے ہوئے
تھے۔ وہ سب حویلی پر ٹوٹ پڑے۔ اُن کے لیے گانے والی کے گانے
کی نسبت اُس کے قتل کا تماشہ زیادہ دل چسپ اور سنسنی خیز تھا۔ اُس
ہجوم پر قابو پانا ناممکن تھا۔

حویلی وسیع و عریض تھی۔ ایک طرف باغیچہ سا تھا جس کے دو طرف
دیوار تھی اور دو طرف برآمدے اور کمرے تھے۔ یہ سہانوں کے لیے تھے قبر مائی
اور قوالوں کو انہی کمروں میں سے کمرے دیے گئے تھے۔ میں اور راجیش جب
اس حصے کے دروازے میں داخل ہوئے تو لوگ ہمارے راستے میں آ رہے
تھے۔ کبھی کی راہنمائی میں ہم اُس کمرے میں پہنچے جہاں فرش پر قبر مائی کی لاش
پڑی تھی۔ خون اتنا کہ دروازے تک آ گئی تھا۔

میں نے اور راجیش نے لاش کو پیٹھ کے بل کیا۔ پیٹ چاک تھا اور

اندریاں وغیرہ باہر آ کر بکھر گئی تھیں۔ ایک زخم دل کے مقام پر تھا۔ خنجر یا چاقو
استعمال کیا گیا تھا۔ ہم دونوں نے لاش کا نظری معائنہ کیا۔ حسین مغنیہ اُسی
لباس میں تھی جو پہنے ہوئے اُس نے گانے سنائے تھے۔ لباس پھٹا ہوا
یا اتر ا ہوا نہیں تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اُسے صرف قتل کیا گیا ہے۔ اس
سے پہلے اس کے ساتھ کوئی اور زیادتی یا چھیڑ چھاڑ نہیں کی گئی۔ اُس کے
گلے میں قیمتی ہار تھا۔ انگلیوں میں سونے کی دو انگوٹھیاں، کانوں میں سونے
کے ٹھکے اور کلائیوں میں سونے کی چوڑیاں تھیں۔ ہر ایک چیز جسم پر موجود
تھی۔ پنگ پر اُس کا پرس پڑا تھا۔ کھول کر دیکھا۔ نوٹوں سے بھرا پڑا تھا۔ یہ
ویلوں کی رقم تھی۔

”عداوت یا رقبابت“۔ راجیش نے کہا۔

میں نے تائید میں سر ہلایا۔ یہ بات صاف تھی کہ قاتل کو مقننہ کے
نہ حسن و جوانی کے ساتھ کوئی دلچسپی تھی نہ اُس کے زیورات اور رقم کے ساتھ۔
وہ اُسے قتل کرنے آیا تھا، قتل کر گیا۔ یہ بھی واضح تھا کہ قاتل بہت دلیر تھا
یا کوئی اس حویلی کا رہنے والا تھا جو اطمینان سے اندر آیا اور قتل کر گیا۔

ہم لاش کو دیکھ رہے تھے۔ اُسے اٹا پٹا کر دیکھا۔ باہر حویلی کے
اندرونی باغیچے اور برآمدوں میں جو شور و غل تھا اس سے پتہ چلتا تھا کہ تماشا ئی
کا سارا ہجوم اندر آ گیا ہے۔ اچانک ایک بلند اور گہرائی ہوئی آواز سنائی
دی۔ ”مار گیا... ادھر آنا“۔ اور بھگدڑ مچ گئی۔ میں اور راجیش کمرے
سے نکلے۔ ایک آواز کانوں میں پڑی۔ ”تحصیلدار صاحب کو چاقو مار

گیا ہے۔“

باغیچے کی دیوار کا ایک ہی دروازہ تھا۔ میں ہجوم کو چترتا مٹاشیوں کو گھونسنے، کندھے اور ٹھٹھا مارتا دروازے تک گیا اور دروازہ بند کر کے پتھر چڑھا دی۔ راجیش کو آواز دی۔ وہ بھی ہجوم میں سے بڑی مشکل سے مجھ تک پہنچا۔ وہاں روشنی کم تھی صرف دو بلب۔ جل رہے تھے جن کی روشنی ہجوم نے روک رکھی تھی۔

”راجیش!“ میں نے کہا۔ ”تین چار آدمی یہاں لاؤ جو کسی کو باہر نہ نکلنے دیں۔“

اُس نے کچھ نام پکارے۔ میں نے بڑی بلند آواز سے کہا۔ ”تمام آدمی جہاں جہاں کھڑے ہیں وہیں بیٹھ جائیں اور خاموش ہو جائیں ورنہ ہم گولی چلا دیں گے۔“

گولی چلانے کے لیے نہ میرے پاس کچھ تھا نہ راجیش کے پاس۔ ہجوم بیٹھنے لگا۔ تین چار آدمی میرے پاس دروازے پر آگئے۔ میری سکیم یہ تھی کہ دروازے سے ایک ایک آدمی کی تلاشی لے کر باہر نکالا جائے۔

”ملک صاحب!“ راجیش نے کہا۔ ”چل کے دیکھو تو سبھی تحصیلدار زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ ہم نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ ہوا کیا ہے۔“ اُس نے ان آدمیوں کو جو اُس نے بلائے تھے، سختی سے کہا۔ ”کسی کو باہر نہ نکلنے دینا خواہ کوئی اس حویلی میں رہنے والا ہی ہو۔“

باغیچہ خاصا وسیع تھا۔ اس میں پودے تھے اور گھاس کے پلاٹ بھی

اور اس میں درخت بھی تھے۔ میں راجیش کے ساتھ اُس برآمدے میں گیا جہاں کہتے تھے کہ تحصیلدار زخمی پڑا ہے۔

تعاقب بیکار تھا

کچھ آدمی ارد گرد بیٹھے تھے اور ان کے درمیان تحصیلدار پڑا تھا۔ ایک نبض پر میں نے ہاتھ رکھا، دوسری پر راجیش نے۔ وہ زندہ تھا۔ وہ پٹھکے بل پڑا تھا اور اُس کا بھی پیٹ قمر بانی کی طرح چاک تھا۔ پیٹ کے اندرونی حصے باہر آگئے تھے۔ اُسے فوری طور پر ہسپتال لے جانا بیکار تھا۔ اُس کی زندگی ختم ہو چکی تھی۔ ہمیں اُس کا زخمی بیان لینا تھا۔

”آپ کو کس نے زخمی کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

جواب میں وہ اپنا ایک ہاتھ مونچھوں تک لے گیا اور انگلیوں سے مونچھیں مردٹنے کا اشارہ کیا۔ اُس کی مونچھیں بہت چھوٹی تھیں۔ میں اشارہ سمجھ گیا۔ قاتل کی مونچھیں بڑی اور مردٹ مردٹ کر نوکدار کی ہوتی تھیں۔ تحصیلدار کے ہونٹ پلے۔ میں نے کان اُس کے منہ کے قریب کیا۔ اُس کی سرگوشی تالی دی مگر صرف اتنی۔ ”نا۔“ ہو سکتا ہے اُس نے ”نہ“ کہا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ قاتل کا نام بتا رہا تھا مگر ”نا“ کے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔ نام پورا نہ بتا سکا۔ میں نے اُس کا آخری خراٹہ منسا اور وہ مر گیا۔

میں نے اور راجیش نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ہجوم بیٹھ

نے جو گیارنگ کا پا جامہ اور اسی رنگ کا کرتہ پہن رکھا تھا اور اُس نے سر پر میلے سے رنگ کی چادر لے رکھی تھی جس سے اُس کا سر ڈھانپا ہوا تھا۔ وہ اچانک اٹھا اور درخت پر چڑھ گیا۔ میں نے درخت کا تنا دیکھا۔ اس پر تیزی سے چڑھنا مشکل نہیں تھا۔

”اُس کی مونچھیں بڑی بڑی تھیں؟“ میں نے پوچھا۔
 صرف ایک آدمی نے یقین کے ساتھ بتایا کہ اُس کی مونچھیں گھنی اور لمبی تھیں، لیکن اُس کا چہرہ کوئی بھی بیان نہ کر سکا کیونکہ چادر ماتھے سے بھی نیچے آئی ہوئی تھی اور نیچے سے چادر نے ٹھوڑی بھی ڈھانپ رکھی تھی۔ یہ بھی کوئی نہ بتا سکا کہ اُس کے کپڑوں پر خون تھا یا نہیں۔ بہر حال یہ تصدیق ہو گئی کہ قابل بڑی بڑی مونچھوں والا تھا۔ مقتول تحصیلدار کے اشارے کو میں صبح سمجھا تھا۔

تین طاہریں چار کھارٹیاں

سانپ نکل گیا تھا۔ اب ہیں اس کی لکیر کا تعاقب کرنا تھا۔ میں نے یہ انتظام کر دیا کہ ساتھ والی گلی میں کوئی نہ جائے۔ ہجوم حویلی کے سامنے تھا میں ساتھ والی گلی میں گھرے دیکھنا چاہتا تھا۔ کھوج کے انتظار میں وقت ضائع ہو جانے کا خطرہ تھا۔ میں دال ابھری تھا۔ راجیش سے کہا کہ وہ اس دہرے قتل کی ابتدائی اور ضروری کاغذی کارروائی کر لے اور لاشوں کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دے۔ اس سے پہلے اُسے یہ کام کرنا تھا کہ حویلی والے باغیچے

چکا تھا اور خاموش تھا۔ اچانک آواز سنائی دی ”وہ گیا...“ ارے کون ہے۔“ اس کے ساتھ ہی ہجوم میں پھر مچلنے لگی۔ راجیش نے اپنی دنگ آواز میں گرج کر کہا ”خاموش... بیٹھے رہو۔“

ہم نے ایک آدمی کو نیم کے درخت پر چڑھتے دیکھا۔ وہ پرانا اور پھیلا ہوا درخت تھا۔ شمن موٹے تھے اور وہ درخت دیوار کے قریب تھا۔ کچھ شمن دیوار کے اوپر سے باہر کو گئے، ہوئے تھے۔ دیوار کی اونچائی دس فٹ کے لگ بھگ تھی۔ ہم درخت سے اتنی دُور تو نہیں تھے مگر ہجوم میں سے گزر کر اُس آدمی تک پہنچنا جو شمن پر چلا گیا تھا، ممکن نہیں تھا۔ راجیش چلایا ”اے پکڑو اسے“ مگر کسی نے اوپر جانے کی جرأت نہ کی۔ ہماری مجبوری یہ تھی کہ ہمارے پاس ریو اور نہیں تھے۔ میں اور راجیش ممان آئے ہوئے تھے۔

میں اُس آدمی کی چال سمجھ گیا اور دروازے کی طرف دوڑا مگر بیٹھے ہوئے آدمیوں نے مجھے تیز نہ دوڑنے دیا۔ میں نے دروازہ کھولا، باہر نکلا اور اُس طرف گیا جدھر شمن جاتا تھا۔ اُدھر گئی تھی۔ باہر بھی لوگ جمع تھے اور میرے راستے میں رُکاوٹ بنے ہوئے تھے۔ میں اُس گلی میں گیا۔ اُدھر اندھیرا تھا اور گلی خالی تھی۔ مجھے ایک آدمی دوڑتا سائے کی طرح دکھائی دیا اور اندھیرے میں گم ہو گیا۔ تعاقب بیکار تھا۔ قاتل نکل گیا۔

میں اندر چلا گیا اور اُس درخت کے پاس گیا جس پر وہ آدمی چڑھا اور شمن کے راستے دیوار پھیلا گیا تھا۔ وہاں جو آدمی تھے، اُن سے پوچھا کہ وہ آدمی کہاں تھا اور کسسا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ قریب ہی بیٹھا ہوا تھا اُس

کے حصے کا دروازہ ذرا سا کھول کر اندر روکے ہوئے لوگوں کو ایک ایک کر کے باہر نکالے اور سب کی جامہ تلاشی لے اور کپڑوں پر خون کے دھبے دیکھے۔ رامیش زمین اور قابل انسپکٹر تھا۔ اُسے کسی ہدایت کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے لڑکی کے باپ سے کہا کہ مجھے دتین ٹارچوں اور تین چار دیوڑیوں کی ضرورت ہے جو لاطینوں یا کالمیوں سے مسلح ہوں۔ میری یہ ضرورت فوراً پوری کر دی گئی۔ اُس زمانے میں ایک ایک فٹ لمبی ٹارچیں بھی ہوتی تھیں۔ مجھے تین ٹارچیں مل گئیں۔ تینوں بڑی تھیں۔ ایک اچھے ہاتھ میں اور ایک ایک روآدمیوں کو دے دی۔ میرے ساتھ چار آدمی تھے۔ سب کے پاس کلہاڑیاں تھیں۔

میں انہیں ساتھ لے کر اُس گلی میں گیا جس میں قاتل دیوار سے کودا تھا۔ وہاں مٹی کچی درمچھول تھی۔ کھڑے بڑے صاف تھے۔ یہ فلیٹ شوژ کے تہنیں پی ٹی شوژ بھی کہتے ہیں، نشان تھے۔ میں نے تو بے کے نشان سے سچا پائس دور میں ان کے تو بے رہنے کے ہوئے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کس طرح اتنی تیزی سے درخت پر چڑھ گیا تھا۔ اگر جوئی چڑھے کے بڑے والی ہوتی تو جوئی پسینے ہوئے وہ درخت پر نہ چڑھ سکتا۔ میں نے کھجور کھرا نہیں اٹھایا تھا یعنی میں نے پاؤں کے نشان دیکھ کر کھجور سرخروسانی نہیں کی تھی۔ یہ ماہر کھجوروں کا فن ہے جو شکل اور سیمپیدہ فن ہے۔ میں نے کھجوروں کو کھرا اٹھاتے دیکھ دیکھ کر کچھ سوچا جو جھوٹا کر لی تھی۔

فلیٹ شوژ کا کھرا دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ کھرا اٹھالوں گا۔ یہ آسان تھا۔

میں تین ٹارچوں کی روشنی میں آگے بڑھنے لگا۔ کھڑے صاف تھے۔ یہ مجھے گاؤں سے باہر لے گئے۔ یہ جوئی گاؤں کے باہر تھی۔ آگے بگڑنا ہی آگئی۔ اگر آپ نے دیہات کی بگڑناں دیکھی ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان پر کتنی دھول ہوتی ہے۔ قاتل میں پچیس قدم بگڑنا ہی پر چلتا رہا، پھر ساتھ والے کھیت میں داخل ہو گیا۔ میری خوش قسمتی کہ کھیت خالی تھا۔ یہاں مجھے کھرا تلاش کرتے کچھ دقت ہوئی لیکن میں بھٹکا نہیں۔

آگے سبز یوں والا باغ آگیا۔ یہ خاصا وسیع باغ تھا۔ میں نے آواز میں ”کوئی ہے؟“ ... او بے باہر نکلو۔ بار بار لپکارنے کے باوجود کوئی نہ آیا تو میں سمجھ گیا کہ باغ والے بھی تماشہ دیکھنے چلے گئے ہیں۔ باغ کے کنارے ہی کیا رہے تھے۔ بعض میں سبزیاں اگی ہوئی تھیں اور بعض خالی تھے۔ کھرا بڑا صاف تھا۔ قاتل کیا روں میں سے گذرا تھا۔ میں تین ٹارچوں کی روشنی میں چار سوچ آدمیوں کے آگے آگے کھرا دیکھتا بڑھتا گیا۔ باغ سے نکلا تو کھیت آگئے۔ باغ اور کھیتوں کے درمیان گز بھر چوڑا راستہ تھا۔ اس پر بھی دھول اتنی کہ پاؤں کا نشان صاف نظر آتا تھا۔

گاڑی آئی اور گئی

یہاں کھڑے دو ہو گئے۔ دوسرا کھرا بھی فلیٹ شوژ کا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جوئی سے درخت کے ذریعے باہر آنے والے کا ایک

سامنے میاں کھڑا تھا۔ اب دونوں پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ مجھے ایک خیال آیا۔ قاتل ایک تھا یا دو، وہ اس جرم کے استاد تھے، لیکن وہ دیہاتی نہیں تھے۔ اگر وہ دیہات کے رہنے والے پیشہ ور قاتل ہوتے تو اپنے کھڑوں کے متعلق لاپرواہ ہوتے۔ ہر دیہاتی جانتا ہے کہ واردات ہوتی ہے اور کھوجی کھڑا اٹھاتا ہے۔ استاد تو پوری طرح محتاط ہوتے تھے۔ وہ کنکریوں والے راستوں پر چلتے تھے۔ کھوجیوں کو گمراہ کرنے کے لیے ندیوں میں اتر جاتے اور دُور جا نکلتے تھے۔ اگر زیادہ ہوں تو قطار میں چلتے تھے تاکہ ایک دوسرے کے کھڑے پاؤں تلے ٹپتے جائیں۔

یہ قاتل شہر کے معلوم ہوتے تھے۔ شہروں میں مجرموں کے کھڑے نہیں ملا کرتے۔ مکان پختے، سڑکیں اور فٹ پاتھیں بھی پٹی ہوتی ہیں۔ شہروں میں انگیرل کے نشان دیکھے جاتے ہیں لیکن جو مدیاؤں کے نشان کر سکتے ہیں وہ انگیرل کے نشان نہیں کر سکتے۔ یہ مجرم شہری ہو سکتے تھے جو کچے راستوں اور نرم نرم کیا روں پر چلتے رہے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ دیہات کی زمین جرم کو پکڑ لیا کرتی ہے۔ اُن کے شہری ہونے کا ایک اور ثبوت یہ ذہن میں آتا تھا کہ شہری گانے والی کے ساتھ کسی دیہاتی کی کیا دشمنی ہو سکتی تھی۔ قمر بانی کے قتل کا باعث رقابت تھا یا کوئی عداوت۔ قاتل شہری ہی ہو سکتے تھے۔ البتہ تحصیلدار کا قتل ذہن میں کچھ پیچیدگی پیدا کر رہا تھا۔

میں بھی کچھ سوچتا اور کھڑے دیکھتا بیٹھا جا رہا تھا۔ مجھے ریل گاڑی کی آواز سنائی دی جو دُور تھی، پھر انجن کی دُسل سنائی دی۔ میں نے اُدھر دیکھا۔ دُور سے

انجن کی روشنی نظر آئی۔ میں گاؤں سے تقریباً ایک میل دُور آ گیا تھا۔ وہاں سے ریلوے سٹیشن تقریباً پونے دو میل دُور تھا۔ کھڑوں کا رخ اُدھر ہی تھا۔ میں نے اپنے ساتھ کے دواؤں سے پوچھا کہ ریلوے سٹیشن کو اور کوئی راستہ جاتا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ گاؤں سے ایک کچا راستہ نکلتا ہے وہ سیدھا ریلوے سٹیشن تک جاتا ہے۔ وہ چھوٹا سا سٹیشن تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ ایک مسافر گاڑی دن کو یہاں رکتی ہے اور ایک رات کو۔

پولیس کی چھی جس نے مجھے بتایا کہ دونوں مجرم ریلوے سٹیشن پہنچ گئے ہل دِرا اس گاڑی سے چلے جائیں گے۔ میرے پاس کوئی سواری نہیں تھی۔ میں اتنی تیز بھی نہیں دوڑ سکتا تھا۔ گاڑی ریلوے سٹیشن میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے وہاں سے کھڑا اٹھنا ترک کر دیا اور بہت تیز ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑا۔ گاؤں سے آنے والا راستہ آ گیا۔ یہ کچی پگھڑی تھی۔ میں نے ڈک کر ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ بڑے سات کھڑے نظر آ گئے۔ میں اور تیز چل پڑا۔ گاڑی رُک اور کُن سلسلے دینے لگا پھر گاڑی چل پڑی۔ مجھے یقین ہونے لگا کہ قاتل نکل گئے ہیں۔

قاتل بغیر ٹکٹ گئے

میں جب ریلوے سٹیشن پہنچا تو گاڑی دُور جا چکی تھی۔ سٹیشن ماسٹر اپنے کوارٹر کو جا رہا تھا۔ اُسے روکا اور اُس کے دفتر لے گیا۔ فنگٹ کلر کو بلایا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا اور اُسے بتایا کہ ایک گانے والی اور ایک تحصیلدار قتل

ہو گئے ہیں۔ سٹیشن ماسٹر نے بتایا کہ وہ بھی وہاں مدعو تھا لیکن اُس کا ایک افسر گذر رہا تھا اس لیے نہ جاسکا۔ میں نے اُسے بتایا کہ مجھے اُس کے تعاون کی ضرورت ہے۔ بلنگ کلرک سے پوچھا کہ کتنے آدمیوں نے ٹکٹ لیے تھے۔ اُس نے کہا کہ چار ٹکٹ فروخت ہوئے ہیں۔

میں نے اُس سے پوچھا کہ ان چاروں کے علیے اور چہرے اُسے یاد ہیں؟ اُس نے جواب دیا کہ چہرے دیکھنا اور یاد رکھنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ سوچنے لگا پھر کہنے لگا کہ تین مرد تھے جو بالکل دیہاتی تھے اور ایک ادھیڑ عمر عورت تھی۔ ”اُن میں سے کسی کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں؟“ میں نے پوچھا ”سُر پچاڑ اور اُس کے کپڑے جو گیارہ رنگ کے ہوں گے۔“

”نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”اسی بڑی بڑی مونچھوں والا کوئی نہیں تھا اور کسی کے سر پر چادر بھی نہیں تھی۔“

کانٹے بننے والا ایک ملازم وہاں کھڑا تھا۔ اُس نے کہا ”میں نے دو آدمیوں کو چلتی گاڑی پر سوار ہوتے دیکھا تھا۔ میں ڈرائیور کو گوکہ (ٹوکن) دینے گیا تو گاڑی چلنے کا وقت ہو گیا۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ گاڑی چل پڑی تو ایک طرف سے، پلیٹ فارم کے باہر سے، دو آدمی دوڑے آئے اور دونوں پہلے ڈبے کے پہلے کپار ٹنٹ میں سوار ہو گئے۔ انہوں نے یقیناً ٹکٹ نہیں لیے تھے۔“

”ان میں سے ایک کی مونچھیں بڑی بڑی تھیں؟“ میں نے پوچھا۔ ”تم نے غور سے تو نہیں دیکھا ہوگا۔“

”دونوں نے سروں پر اس طرح چادریں لے رکھی تھیں کہ اُن کے چہرے چھپی

طرح نظر نہیں آتے تھے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”وہاں روشنی کم تھی.... آپ باوصاحب سے جو گیارہ ٹکٹوں کا پوچھ رہے تھے۔ مجھے ایسے خیال آتا ہے جیسے ایک کے کپڑے جو گیارہ رنگ کے تھے۔“

یہ تھے میرے مجرم۔ انہوں نے ٹکٹ نہیں لیے تھے۔ وہ گاڑی کے وقت سے پہلے سٹیشن تک پہنچ گئے ہوں گے لیکن پلیٹ فارم سے باہر ان کی طرف کہیں رُکے رہے۔ گاڑی چلی تو دوڑ کر سوار ہو گئے۔

میں نے سٹیشن ماسٹر سے پوچھا کہ اس وقت گاڑی کہاں ہوگی۔ ان سے باتیں کرتے ہوئے گھنٹہ گزر گیا تھا۔ سٹیشن ماسٹر نے پچیس میل دور کے ایک سٹیشن کا نام لیا۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ اُس سٹیشن ماسٹر کو فون کرے اور کہے کہ گاڑی کو وہیں روکے رکھے سٹیشن ماسٹر بھی پایا۔ میں نے اُسے کہا کہ دو انسان قتل ہو گئے ہیں اور قاتل اس گاڑی میں فرار ہو رہے ہیں۔ میں پولیس آفیسروں۔ اگر گاڑی نہ روکی گئی اور قاتل نکل گئے تو سٹیشن ماسٹر جواب دہ ہوگا کہ اُس نے گاڑی روکنے کا انتظام کیوں نہیں کیا۔

سٹیشن ماسٹر نے وہ سٹیشن ملا دیا اور وہاں کے سٹیشن ماسٹر کو میرے متعلق بتا کر فون مجھے دے دیا۔ پتہ چلا کہ وہ سٹیشن ماسٹر مجھے اچھی طرح جانتا ہے اور میرے طریقہ گفتگو سے بھی واقف ہے۔ اُس نے بتایا کہ گاڑی اُس کے سٹیشن میں داخل ہو رہی ہے اور وہ اُسے روکے رکھے گا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں لاری پر آ رہا ہوں۔ میں نے اُسے تسلی بھی دی کہ میں اُسے تحریر دے دوں گا کہ میں نے گاڑی روکائی تھی اور اگر وہ کہے گا تو میں اُس کے اعلیٰ حکام کو بھی مطلع

کردوں گا۔

اس کے علاوہ میں نے سٹیشن ماسٹر سے کہا کہ وہ اگلے ڈبے کے پہلے کمپارٹمنٹ پر نظر رکھے۔ وہاں جو گیارہ رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے، بڑی ٹوچھوں والا ایک آدمی ہوگا۔ اُس کے کپڑوں پر خون کے دھبے بھی ہوں گے۔ اگر یہ آدمی گاڑی سے اترے تو اُسے پکڑنے کی کوشش کرے اور بہتر یہ ہے کہ وہ تھانے سے پولیس کی مدد لے لے۔

قاتل تیز اور ذہین نکلتا

ریلوے سٹیشن سے مجھے سائیکل مل گئی۔ میں اس پر سوار ہوا اور شادی والی حویلی پہنچا۔ راجیش لاشیں اٹھوا کر تھانے لے گیا تھا۔ انہیں پوسٹ مارٹم کے لیے پندرہ میل دور جانا تھا۔ میں نے بارات والی بسوں میں سے ایک بس لی۔ دو آدمی ساتھ لیے اور اُس سٹیشن کو روانہ ہو گیا جہاں مسافر گاڑی ٹکی ہوئی تھی۔ راجیش کا تھانہ وہاں سے چند میل دور راستے میں تھا۔ وہاں ذرا سا رُک کر اُسے بتایا کہ میں کیا کچھ کر آیا ہوں اور اب کہاں جا رہا ہوں۔ اُس کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی۔ چلتے چلتے اُس نے دو کانٹیل میرے ساتھ روانہ کر دیے۔

میرے کہنے پر ڈرائیور نے بس بہت تیز چلائی۔ سڑک خالی تھی بس نے پچیس میل کا فاصلہ بیس منٹ میں طے کر لیا۔ میں سیدھا ریلوے سٹیشن گیا۔

گاڑی رُک کر کھڑی تھی۔ سٹیشن ماسٹر نے تھانے سے مددگواہی تھی۔ ایک بیڈ کانٹیل چار کانٹیلوں کے ساتھ آ گیا تھا۔ یہاں میں ایک بات کہوں گا۔ پولیس اگر دیانت داری سے مجرموں کو پکڑنے کی کوشش کرے تو جرائم تو بے فیصد ختم ہو سکتے ہیں۔ یہاں تو بعض کیسوں میں دو تھانیداروں کے درمیان تنازعہ کھڑا ہو جاتا ہے کہ یہ کیس کس تھانے کا ہے۔ ایسے تنازعے میں یوں بھی ہوتا ہے کہ مضروب رخصت کی تاب نہ لا کر مر جاتا ہے اور اُس کا زعمی بیان بھی کوئی نہیں لیتا۔ اس سے مجرم اگر کپڑے بھی جائیں تو استغاثہ کمزور ہونے کی وجہ سے بری ہو جاتے ہیں۔

اس تھانے نے سٹیشن ماسٹر کی اطلاع پر پولیس سٹیشن پر بھیج دی۔ خود میرا یہ حال تھا کہ یہ میرا کیس نہیں تھا لیکن میں تعاقب میں بلکان ہوا جا رہا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ قاتل پولیس سے زیادہ تیز اور ذہین نکلتے۔ وہ اس طرح کہ میں گاڑی کے پہلے کمپارٹمنٹ میں گیا۔ مسافر زیادہ نہیں تھے۔ سب کو دیکھا۔ ٹوچھیں تو کئی ایک کی تعین مگر جو گیارہ کپڑے کسی کے نہیں تھے۔ باوردی پولیس میرے ساتھ تھی مسافر ڈر گئے۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ فلاں سٹیشن سے دو مسافر چلتی گاڑی پر سوار ہوئے تھے، وہ کون ہیں؟

ایک نے بتایا اور تین چار نے اُس کی تائید کی کہ وہ دروازے میں کھڑے رہے تھے۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ایک نے جو گیا پا جامہ اور اسی رنگ کا کمرٹہ پہن رکھا تھا۔ دوسرے کا پا جامہ کمرٹہ سیلٹی تھا۔ جو گیا کپڑوں والے کی ٹوچھیں گھنٹی اور مروڑی ہوئی تھیں۔ دونوں نے گمرے سیٹی رنگ کی قیمتی چادریں لے

رہی تھیں۔

میں نے اور زیادہ کریدا تو ایک مسافر نے بتایا کہ دونوں نے فلیٹ شو زمین رکھے تھے۔ صرف ایک مسافر نے میرے اس سوال کا جواب دیا کہ اُن کے کپڑوں پر سُرخ داغ یا چھینٹے تھے یا نہیں۔ اُس نے کہا کہ سلیٹی کپڑوں والے کے پا جاعے پر کچھ سُرخ دھبے نظر آتے تھے۔ اُن کے کُرتے چادروں میں ڈھکے ہوئے تھے۔ وہ گئے کہاں؟

مسافروں نے بتایا کہ گاڑی اس سٹیشن پر رُکی تو رُکی ہی رہی۔ وہ دونوں دروازے میں سے باہر دیکھتے رہے۔ یہاں گاڑی دو منٹ سے زیادہ نہیں رُکتی مگر پندرہ بیس منٹ گزر گئے۔ ان دونوں میں سے ایک جس نے سلیٹی کپڑے پہن رکھے تھے اُتر گیا۔ دوسرا دوسری طرف والے دروازے سے باہر دیکھنے لگا۔ وہ جوگی کپڑوں والا تھا۔ سلیٹی کپڑوں والے نے پائیدان پر کھڑے ہو کر اپنے ساتھی کو آواز دی۔ ”نادر! نادر! نادر!“ اُس کی طرف دیکھا تو شاید انہوں نے ایک دوسرے کو اشارے کیے۔ نادر میں کھڑا رہا۔ اُس کا ساتھی اُس کے پاس آگیا اور دونوں اس طرف اُتر گئے۔ تھوڑی دیر بعد میں، ہیڈ کانسٹیبل اور چھ کانسٹیبلوں کے ساتھ پہنچ گیا۔

میں نے پلیٹ فارم کے دوسری طرف دیکھا جدھر وہ اُتر گئے تھے اُدھر اندھیرا تھا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ تین آدمی اُدھر گاڑی کی لمبائی تک پھیلادے۔ اُسے ان کے ساتھ اس حکم سے صحیح دیا کہ کوئی آدمی گاڑی سے اُتر کر بھاگنے کی کوشش کرے تو اُسے پکڑے اور اگر وہ نہ رُکے تو اُس کی ٹانگوں

پر گولی چلا دے۔

میں نے تین کانسٹیبلوں کو پلیٹ فارم پر پھیلادیا۔ خودیوں کیا کہ اس کانسٹیبل کے دو مسافروں کو جو جبروں کو پہنچاتے تھے، ساتھ لیا اور گاڑی کے تمام ڈبوں میں گھوم گیا۔ ہر ایک مسافر کو دیکھا، مگر جو گیا اور سلیٹی کپڑوں والے نہ ملے۔ یہ میں نے محض ایک کارروائی پوری کی تھی۔ توقع یہی تھی کہ وہ نکل گئے ہوں۔ اس کارروائی کے بعد میں نے سٹیشن ماسٹر اور گاڑی کے گارڈ کو ان کی ضرورت کے مطابق تحریر دے دی۔ میں سمجھ گیا کہ دونوں قاتل ہوشیار تھے۔ گاڑی کو رُکے زیادہ وقت ہو گیا تو وہ چوکس ہو گئے۔ انہوں نے ہیڈ کانسٹیبل کو کانسٹیبلوں کے ساتھ پلیٹ فارم پر کچھ لیا ہوگا۔ انہیں دیکھتے ہی کھسک گئے۔

اس کارروائی کے بعد مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میرے پاس سوچنے کے لیے وقت ہی کہاں تھا۔ میں تعاقب میں تھا اور ساتھ ساتھ سوچ بھی رہا تھا۔ مجھے گاڑی رکوانی نہیں چاہیے تھی بس میرے پاس تھی جو گاڑی کی رفتار سے دُکئی رفتار پر چل سکتی تھی میں اگلے سٹیشن پر چلا جاتا اور گاڑی رُکتے ہی قاتلوں کے کپڑے میں جا دھکتا۔ انہیں بھاگ نکلنے کا موقع نہ ملتا۔ بہر حال یہ یقین ہو گیا کہ قاتل یہی دو ہیں ان کا کچھ حلیہ اور نشانیال بھی معلوم ہو گئیں۔

میں بس میں بیٹھا اور واپس راجیش کے تھانے میں چلا گیا۔

طوائفوں اور ناچنے گانے والیوں کی دنیا

راجیش تمام ترکاغذی کارروائی مکمل کر چکا تھا۔ لاشیں پوسٹ مارٹم کے

یہ چلی گئی تھیں۔ قربانی کی ناکھ اور اُس کے ساندے لڑکی والوں کے گھر میں تھے۔ راجیش نے مجھے بتایا کہ وہ اُن سے وہیں جا کر پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے مجھ سے درخواست کے لیے میں کہ کہیں اتفاق سے وہیں ہوں اور اُس کے ساتھ رہوں میں رات تک توڑک سکتا تھا، اگلے دن رکن میرے بس سے باہر تھاتا ہم میں نے اُس کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا اور ہم دونوں لڑکی والوں کے گھر چلے گئے۔ طوافیوں اور ناچنے گانے والیوں کی اپنی دُنیا ہوتی ہے۔ اُن کے طور طریقے الگ، سیاست الگ، اُن کی جاہت الگ اور اُن کے تعصبات اور عداوتیں الگ ہوتی ہیں۔ وہاں دوستی اور دشمنی کا تصور کچھ اور ہوتا ہے۔ وہاں جسم اور ناز و انداز کا کاروبار ہوتا ہے اور محبت صرف پیسے سے ہوتی ہے اس دُنیا میں کوئی واردات ہو جائے تو سراخ لگا ناشکل نہیں ہوتا۔ پولیس والے معمول کی اس منڈی کو بڑی اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

قربانی گانے والی خوبصورت عورت تھی بلکہ میں اسے لڑکی کہوں گا۔ اُس کے چاہنے والے کئی ہوں گے اور اُن سب میں رقابت لازمی تھی۔ قربانی اور تحصیلدار کا قتل رقابت کا ہی نتیجہ معلوم ہوتا تھا۔ ہمیں سب سے پہلے یہ معلوم کرنا تھا کہ قربانی کے چاہنے والے کون کون تھے۔ گانا سننے کے لیے تو اُن کے کونٹھے پر بے شمار لوگ جاتے ہوں گے لیکن چند ایسے اُن کے پٹھے بھی ہوتے ہیں جو گانے والیوں کو دل دے بیٹھتے ہیں اور اُن کے اس جھانسنے پر آجاتے ہیں کہ وہ بھی انہیں دل و جان سے چاہتی ہیں۔

لڑکی کے جاگیردار باپ کے گھر گئے۔ وہاں تو دولت ٹٹ رہی تھی اور

دُور دُور سے تماشائی آئے ہوئے تھے۔ وہاں بارات بھی اُتری ہوئی تھی مگر اب وہاں اُتو بول رہے تھے۔ رات کی تاریکی میں ایسے لگتا تھا جیسے یہ محل صبیحہ حویلی آسیب زدہ ہو گئی ہو۔ رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تھی۔ وہاں چند ایک آدمی جو اس حویلی کے ملازم اور کمین تھے اور باراتی موجود تھے لیکن ایسی خاموشی جیسے وہاں کوئی بھی نہ ہو۔

لڑکی کے باپ اور لڑکے کے باپ نے مجھے کہا کہ میں نفیش اپنے ہاتھ میں رکھوں۔ لڑکے کا باپ مجھے وہیں رکھنے پر زیادہ اصرار کر رہا تھا۔ میں نے اُسے بتایا کہ میں اپنے آپ ہی دوسرے تھانے کے کیسوں میں دخل اندازی نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ میں اپنے تھانے سے غیر حاضر نہیں ہو سکتا۔ یہ تو بتایا نہیں جاسکتا تھا کہ نفیش کتنے دنوں یا کتنے مہینوں میں ختم ہوگی۔ دہلا کے باپ نے کہا کہ وہ مجھے ایس۔ پی سے احکام لے دے گا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان دونوں باپوں کا انگریز افسر کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہے اور یہ خوشامدی لوگ ہیں۔ انگریز افسر دل سے اتنا تسلیم لے سکتے ہیں کہ فلاں کیس کی نفیش میں فلاں سب انسپکٹر کو بھی لگا دیا جائے۔

قربانی طواف نہیں تھی

تحصیلدار چالیس سال کا خوب روسلان تھا۔ اُن دنوں دہلی میں ہوتا تھا بالائی آمدنی کے علاوہ بہت سی زمینیں اراضی کا مالک بھی تھا۔ میرا اور راجیش کا خیال تھا کہ تحصیلدار کو اُس کے کسی رقیب نے قتل کر دیا ہے۔ دونوں کا اٹھا قتل بتاتا

تھا کہ ان دونوں کا آپس میں تعلق تھا۔ میں ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ قربانی کسی اور وجہ سے قتل ہوئی اور تحصیلدار کے قتل کا باعث کچھ اور تھا اور یہ کہ دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہیں تھا۔

ہم نے قربانی کے سازندوں اور ناکہ کو اکٹھے ہی الگ بٹھالیا۔ یہ طریقہ صحیح نہیں تھا۔ ان سے الگ الگ پوچھا ہونی چاہیے تھی لیکن راجیش کہتا تھا کہ اکٹھے بٹھانا فائدہ مند رہے گا۔ میں مان گیا۔ قربانی کے سازندے تین تھے اور ایک ناکہ۔ ہم دونوں نے پہلے تو انہیں خوب ڈرایا اور یہ بھی کہا کہ ہم ان چاروں کو مشتبه بٹھا لیں گے اور قاتل ان ہی میں سے کوئی ہوگا۔

”تمہیں کھلی اجازت ہے کہ جھوٹ بولو“ میں نے ان سے کہا۔ ”ہم تمہیں نہیں روکیں گے لیکن تم پولیس کو اچھی طرح سمجھتے ہو۔ ہم دہلی جا رہے ہیں۔ تمہارے اندر کی ہر بات ہمیں خبروں سے اور تمہارے ارد گرد رہنے والے دوسرے خبروں سے معلوم ہو جائے گی، پھر میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ پولیس کو جھوٹی باتیں بتانے کے جرم میں دو دو سال کے لیے اندر کرادوں گا۔“

چاروں اکٹھے ہی بولنے لگے۔ وہ منت سماجت کے لہجے میں یہیں یقین دلا رہے تھے کہ وہ سچ بولیں گے۔ راجیش نے انہیں کہا کہ ان کی بانی مر چکی ہے اور وہ بے روزگار ہو چکے ہیں۔ انہیں اب سچ بولنے سے نہیں ڈرنا چاہیے بلکہ جھوٹ بولنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔

”دہم بتا سکتے ہو کہ تمہاری بانی کو کس نے قتل کیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔ ”دہم کسی کا بھی نام نہیں لے سکتے۔“ ایک نے کہا۔ ”ہمیں کسی پر

شک نہیں۔“

”تحصیلدار کا قربانی کے ساتھ کیا تعلق تھا؟“

”وہ ہمارا لپکا گا ہک تھا۔“ ہمیں جواب ملا۔ ”قمر پر وہ جان نثار کرتا تھا۔“

”ناور کون ہے؟“

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سوچ میں پڑ گئے۔

”اُس کی کوئی گنجین تھی اور مر ڈری ہوئی رہتی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”کبھی کبھی جو گیا رنگ کا کرتہ اور پاجامہ پہنتا ہے۔“

”اوہ نادر۔“ ایک سازندے نے کہا اور اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ”اے دہ نادر۔۔۔ وہ حوض قاضی والا۔“ اور ہم سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”وہ حضور دادا لکیر کرتا ہے۔ نامی دادا (بد معاش) ہے۔“

”تمہارے ہاں کتا تھا؟“ راجیش نے پوچھا۔ ”قربانی کے ساتھ اُس کا تعلق تھا یا کبھی رہا ہے؟“

”نہ جی۔“ ہمیں جواب ملا۔ ”ایک دو مرتبہ آیا ہوگا۔ بانی کا اُس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہم صرف گانے کا کاروبار کرتے تھے قربانی طوائف نہیں تھی۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نادر کے ساتھ تمہاری نہ دوستی تھی نہ دشمنی۔“

”کچھ بھی نہیں جی۔“ انہوں نے کہا۔ ”کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔“

مقتولہ مردوں کی کمزوریوں کو سمجھتی تھی

”تمہارے ہاں گانا سننے والے تو بہت آتے تھے۔“ میں نے کہا۔

”خاص گاہک کون کون سے تھے؟ یعنی جو تہاری بائی کی محبت کا دم بھرتے اور دولت نکالتے تھے؟“

معلوم نہیں سازندوں نے بڑھئی نانکے کی طرف کیوں دیکھا۔ وہ شاید اسے قربانی کا راز دان سمجھتے تھے۔

”وہ ایک تو خیمیلدار صاحب تھے جو قتل ہو گئے ہیں۔“ نانکے نے جواب دیا۔ ”یہ تو صبیح معنوں میں قربانی پر جان نثار کرتے تھے۔ کپڑے وہ لاکے دیتے تھے جو صرف رانیاں اور راجہ ماریاں پہنتی ہوں گی۔ دوسرے نمبر پر اس دولہا کے والد صاحب تھے جو مینے میں دو مین بار دلی آتے اور دن قربانی کے ساتھ گزارتے تھے۔ گانا سننے تھے اور الگ بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔ یہ صاحب دو بھیروں میں اتنا دے جاتے تھے جو عام تاش بین پورا مین آتے تو بھی نہیں دے سکتے تھے۔ تیسرے نمبر پر اسی باپ کا یہ بیٹا تھا جو آج یہاں دولہا بن کے آیا ہے۔ یہ تو شہزادہ ہے۔ جب بھی آتا تھا ضد کرتا تھا کہ قمر کو سیر کے لیے لے جاؤں گا لیکن ہم نے لڑکی کو کبھی بھی اس کے ساتھ جانے نہیں دیا تھا ہمارا کاؤبا گانے تک محدود ہے۔ ہم بیاہ شادیوں پر بائی کو لے جاتے رہے ہیں جہاں ہم چاندوں اس کے ساتھ ہوتے تھے کسی کے ساتھ اکیلے کبھی نہیں جانے دیا چھ نمبر پر ایک ہندو ٹھیکیدار تھا جو قربانی پر فریفتہ تھا۔“

”قمران میں سے کسے چاہتی اور کسے ناپسند کرتی تھی؟“

”آپ بھولے بادشاہ ہیں۔“ ایک سازندے نے ادا سسی مسکراہٹ سے کہا۔ ”ہم لوگ اور ہماری بانیاں صرف پیسے کو چاہتی ہیں۔ قربانی ہر شیا

تھی۔ اپنے پیشے کو اور مردوں کی کمزوریوں کو خوب سمجھتی تھی۔ محبت کا اظہار کرنے والوں کو اس نے کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔ وہ لمبی محنوں کا ڈرامہ کھیلنا جانتی تھی۔ وہ چاہنے والوں کو محنوں بنائے رکھتی تھی۔ جو زیادہ چل جاتا اور غلط ضد کرنے لگتا، اسے وہ شراب پلا پلا کر بے ہوش کر دیتی تھی۔“

”ذرا غور کریں حضور!“ دوسرے سازندے نے کہا۔ ”باپ بیٹا ایک ہی لڑکی پر فدا تھے اور وہ لڑکی محض کاروباری تھی۔ یوں کہنے کہ باپ بیٹا ایک فھو کے سے دل بہلا رہے تھے۔“

”تمہا ہے ہاں اور کون آتا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

میں نے دراصل کچھ اور پوچھا مگر نانکے کچھ اور سمجھی۔ کہنے لگی۔ ”ہمارے ہاں کون نہیں آتا۔ جیل سے نکل کے جراتے ہیں وہ بھی ہمارے ہاں آتے ہیں اور ہم نے انہیں بھی اپنے ہاں دیکھا ہے جو جکڑے آئے تھے۔ ہماری دنیا ننگی ہے حضور! انسان ہمارے کو ٹھٹھوں پر ہی آکر ننگا ہوتا ہے۔ اگر انسانوں کی اصلیت دیکھنی ہو تو ہمارے ہاں آکر دیکھیں۔“

میرا جی چاہ رہا تھا کہ ان سے ایسی ہی باتیں پوچھوں لیکن یہ قتل کی واردات کی تفتیش تھی۔ مجھے اسی دائرے میں رہنا تھا۔

یہ زندگی تمہاری مال تو نہیں

میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ قربانی کے ان چار چاہنے والوں میں آپس

میں عداوت کس کس کی تھی۔ میں نے ان سازندوں اور نانکے پر بہت سوال پھینکے۔ ان کے جوابوں میں سے سوال نکالے۔ جرح کی۔ راجیش بھی سوال پوچھتا اور جرح کرتا رہا۔ اتنی زیادہ مغز کھپائی سے یہ حاصل ہوا کہ تحصیلدار (مقتول) اور دولہا کے بیان چپقلش پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ دونوں قمر کو بڑھ چڑھ کر تحفے دیتے۔ نانکے نے دولہا کے متعلق بتایا کہ وہ قمرائی سے کہا کرتا تھا کہ تحصیلدار کے ساتھ بے رخی سے پیش آیا کرو۔ قمر نے اُسے کہا تھا کہ وہ اپنا کاروبار خراب نہیں کرنا چاہتی۔ نانکے نے بتایا کہ اس شادی سے کوئی ایک ماہ پہلے یہ دولہا دتی گیا اور قمرائی کے ہاں چلا گیا۔ دن کا وقت تھا۔ تحصیلدار کو ابھی تک معلوم نہیں تھا کہ اس نوجوان کا باپ بھی قمرائی کا شیدائی ہے۔ اس نوجوان نے تحصیلدار کے ساتھی گتائی سے بات کی۔ تحصیلدار نے اُسے کہا کہ وہ یہاں سے نکل جائے۔ دولہا پیش میں آگیا۔ اُس نے قمر کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹا۔ اس پر قمر کو غصہ آگیا۔ اُس نے تحصیلدار سے کہا کہ یہ فلاں جاگیر دار کا بیٹا ہے جو یہاں آیا کرتا ہے۔

تحصیلدار اس کے باپ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اُس نے دولہا سے کہا کہ فوراً باہر چلا جائے ورنہ وہ اُس کے باپ کو بتادے گا۔ ترش کلامی میں تحصیلدار نے کہہ دیا۔ ”جیسا باپ ویسا بیٹا“

دولہا نے غصے سے گرجتے ہوئے کہا۔ ”یہ رنڈی تمہاری ماں تو نہیں“ تحصیلدار بھڑک اٹھا کہ قمرائی غصے سے بولی۔ اُس نے دولہا سے کہا۔ ”میں رنڈی نہیں ہوں، میں گاتی ہوں۔ تم نے مجھ میں رنڈیوں (طوائفوں) والی کوں سی بات دیکھی ہے؟“

قمر بانی تحصیلدار کی طرفدار ہو گئی۔ سازندوں نے بتایا کہ چونکہ وہ تحصیلدار تھا، حاکم تھا اس لیے وہ اس سے ڈرتے بھی تھے۔ قمر بانی نے اچھا کیا کہ تحصیلدار کو ناراض نہ کیا۔ دولہا میاں چلے گئے لیکن جاتے جاتے قمر کو یہ دھمکی دے گئے کہ تمہارے منہ پر تیزاب نہ پھینکا تو میں بے غیرت ہوں گا۔ اس انکشاف سے یہ شک قدرتی تھا کہ قمر بانی اور تحصیلدار کو دولہا نے قتل کرایا ہے۔ قتل کا یہ موقع موزوں تھا۔ جاگیر داروں اور ان کے ”راجکاروں“ کے لیے کسی کو قتل کرنا مشکل نہیں تھا۔ کرائے کے پیشہ ور قاتل مل جاتے تھے۔ آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ اس دولہا کو میں جانتا تھا۔ اوباش، عیاش، خود سر اور لڑاکا تھا۔ وہ آج کل کی بیجانی بچپروں کے ہیرو اور دین کی طرح بیڑمیں مارنے والا آدمی تھا۔

جاگیر۔ ایمان کا سودا

راجیش سازندوں اور نانکے سے پوچھ گچھ کر رہا تھا اور میں اپنے ہی ایک خیال میں اُلجھ کر اُس سے لا تعلق ہو گیا۔ اپنے متعلق آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ کٹی چٹی ہوئی، چیری بھاڑی ہوئی اور گلی مٹری لاشیں دیکھ دیکھ کر اور قاتلوں ڈاکوؤں اور عجیب و غریب انبار مل آدمیوں اور عورتوں سے پوچھ گچھ کر کر کے پرسن آفیسر انسانی جذبات سے محروم ہو جاتے ہیں۔ دل پتھر بن جاتے ہیں اور ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے کہ جذبات کو مار دیا جائے۔ اگر ایک حسین و جمیل جوان بوری اپنے بوڑھے اور عیاش

خاندان کو زہر دے کر مار ڈالے اور تھانیدار جذبات کے جال میں آجائے کہ یہ جوان لڑکی قتل پر مجبور ہو گئی تھی اور یہ ظلم ہے تو تمھانے اور حوالاتیں دارالامان بن جائیں کوئی قاتل سزا نہ پاسکے۔

مجھ میں یہ خامی تھی کہ میں اپنے جذبات کو نہ مار سکا۔ قانون کو میں نے جذبات پر کبھی قربان نہیں کیا تھا، سوائے دو تین کیسوں کے لیکن اکثر کیسوں میں میرے جذبات ابل پڑتے تھے اور میں اپنا خون پینے لگتا تھا۔ یہی حال میرا یہاں ہوا۔ اگر اس گانے والی کو اور تحصیلدار کو دولہا نے ہی قتل کر لیا تھا تو اس اور راجیش اسے لاکھوں روپوں کی رشوت کے عوض بھی بخشنے کے لیے تیار نہیں تھے مگر مجھے خیال یہ آ کے بے چین کرنے لگا کہ دولہا شادی کے چوبیس گھنٹے بعد ہی حوالات کا ممان ہو گا۔ یہ ڈوٹی نہیں بے جا سکے گا اور اس کی ازدواجی زندگی کی ابتدا حوالات سے ہوگی اور شاید بچانسی کے تختے پر جا ختم ہو یا یہ اُس وقت قانون اور سزا کی گرفت سے نکلے گا جب اس کی جوانی دھل چکی ہوگی۔

یہ انگریزوں کی عطاک کی ہوئی جاگیر کا قصور تھا... انگریزوں نے یہ جاگیر اس کے دادا پر داد کو اپنی قوم سے غداری کے جھٹلے میں دی تھی جب ہندوستان میں مجاہدین آزادی کی لاشیں درختوں کے ساتھ لٹک رہی تھیں اور ان کے لیڈروں کو غر بھر کے لیے کالا پانی بھیجا جا رہا تھا۔ اُس وقت دولہا کے دادا پر داد انگریزوں سے اسٹرنفیوں کی تھیلیاں اور جاگیریں وصول کر رہے تھے۔ انہی کی نشاندہی پر بے شمار مجاہدین کھڑے گئے اور فرنگیوں کی اذیتوں اور بربریت کا نشانہ بنے تھے۔ اب یہ جاگیر اور ایمان کا یہ سودا رنگ دکھا رہا تھا۔ باپ بیٹا ایک ہی برباخت

مغنیہ کے جنگل میں پھنسے ہوئے تھے۔ ان کے ہاں اخلاق اور کردار کا نام نہ تھا۔ بیٹا قتل کے الزام میں پکڑا جانے والا تھا۔ اگر وہ قتل کرانے کا مجرم نہیں تھا تو بھی یہ صورت کتنی مشرک تھی کہ باپ بیٹا ایک ہی کشتی میں سوار تھے اور یہ کشتی گناہوں کے دریا میں تیر رہی تھی۔ میں آپ کو اپنی نصیحت کی کہانیاں صرف تفریح طبع کے لیے نہیں سنایا کرتا۔ آپ عجز سے میری کہانیاں پڑھیں تو آپ کو ان میں نیکی اور ہمدردی اور جزا اور سزا کا فلسفہ ملے گا اور کچھ عبرت ملے گی اور یہ بھی کہ مجرم کو سزا دینا کا قانون نہیں دے سکتا، اُسے خدا کا قانون ضرور پکڑنا ہے اور کسی نہ کسی رنگ میں سزا دیتا ہے۔

”مسا ملک صاحب!“ راجیش نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ میں نے نہیں سنا تھا۔ سنا تو ہو گا لیکن میرا دھیان اپنے خیالوں پر لکھ گیا تھا۔ ”ایک صورت اور سامنے آ رہی ہے“ راجیش نے کہا۔ ”یہ بھی سن لو۔“

”پھر سناؤ یا ر!“ میں نے قدرے اکتائے لہجے میں کہا۔ ”ہم بانی کا مجرا دیکھنے آئے تھے اور وہ قتل ہو گئی۔“

”اب دوسری بانی کا مجرا سنو۔“ راجیش نے کہا۔

ابلیس کی منہ می میں

راجیش سازندوں سے کچھ نہ کچھ پوچھتا رہا پتہ چلا کہ قبر بانی کی دشمنی ایک

اور گانے والی کے ساتھ تھی جس کا نام کیرتن کماری تھا۔ یہ بات اس طرح سامنے آئی کہ راجیش نے اُن سے پوچھا تھا کہ دلہن کے باپ نے یہاں بلانے کے لیے قربانی کا انتخاب کس طرح کیا تھا۔ کیا بھی اُس کے چاہنے والوں میں سے تھا یا کسی اور نے قربانی کی سفارش کی تھی؟

سازندوں اور نانگہ نے بتایا کہ دلہن کا باپ اُن کے ہاں کبھی نہیں گیا تھا۔ قربانی کا انتخاب دولہا کے باپ اور تحصیلدار نے کیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ دلہن کے باپ نے کیرتن کماری کو پسند کیا تھا لیکن تحصیلدار کو جو دلہن کے باپ کا دوست تھا، پتہ چل گیا۔ اُس نے سودا منسوخ کرا دیا اور قربانی سے بات طے کرا دی۔ دولہا کے باپ نے بھی قربانی کی سفارش کی اور سودا بچا ہو گیا۔

نانگہ نے یہ بات پوری تفصیل سے سُنائی تھی۔ ان تفصیلات اور بظاہر ذرا ذرا سی بے معنی باتوں میں سے نفیثش کے کام کی باتیں نکل آئیں۔ جرح اور سوال در سوال کے سلسلے کے دوران پتہ چلا کہ تحصیلدار پہلے کیرتن کماری کے ہاں جایا کرتا تھا۔ وہ گاتی تھی اور ناچتی بھی تھی۔ اچھی خوبصورت تھی۔ تحصیلدار موٹا گاہک تھا اور حاکم بھی تھا۔ اڑوس پڑوس کی طوائفوں کے دلال ایک دوسرے کے موٹے گاہکوں پر نظر رکھتے اور انہیں اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تحصیلدار نے قربانی کو کسی شادی پر دیکھا تھا۔ وہ پہلی بار قربانی کے ہاں آیا تو ایک دلال نے قربانی کو بتایا کہ یہ سونے کے انڈے دینے والی مرغی ہے۔ ہاتھ سے جانے نہ دینا۔ قربانی نے اسے حسن و جوانی اور ناز و انداز کی زنجیروں میں جکڑ لیا۔

تحصیلدار نے قربانی کو خوش کرنے کے لیے اُسے بتایا تھا کہ وہ اُس

کی خاطر کیرتن کماری کو ٹھکرا چکا ہے۔ اس کے بعد تین مرتبہ ایسے ہوا کہ بیاہ شادی پر متعلقہ لوگوں نے کیرتن کماری سے سودا کیا لیکن تحصیلدار نے سودا منسوخ کرا کے قربانی کا سودا کرا دیا۔ کیرتن کماری قربانی کے گھر سے دو ہی گھر پرے رہتی تھی۔ ایک روز تحصیلدار نے نانگہ اور سازندوں کی موجودگی میں قربانی کو بتایا کہ کیرتن کماری نے اپنا ایک آدمی اُس کے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا تھا کہ ہم سے کیا غلطی ہو گئی ہے کہ آپ ایک طوائف کے قیدی بن گئے ہیں۔ تحصیلدار نے بتایا کہ اُس نے پیغام کا جواب یہ دیا تھا کہ تم قربانی کے پاؤں کی خاک بھی نہیں کچھو اور سخت اور طنز پر باتیں بھی کہلا بھیجی تھیں۔

ایک روز کیرتن کماری کا ایک آدمی قربانی کے ایک سازندے سے ملا اور اُسے دھمکی کے لہجے میں کہا کہ اپنی حرکتوں سے باز آ جاؤ ورنہ پچھتاؤ گے۔ تین مرتبہ کیرتن کماری کا سودا منسوخ ہوا اور اُس کی جگہ قربانی چلی گئی۔ اس کے بعد کیرتن کماری اور قربانی کی لڑائی بھی ہوئی تھی۔ کیرتن کماری نے قربانی کے قریب آکر کہا تھا: "میں نشے میں مست ہوئے متارے کا ہوں کو تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔"

میں نے بھی بال کی کھال اُتارنی شروع کر دی۔ قتل کا باعث ان دونوں نے گانے والیوں کی کاروباری رقابت اور عداوت بھی ہو سکتی تھی۔ سوال پیدا ہوا، کیا کیرتن کماری نام کی یہ گانے والی قتل کرا سکتی ہے؟۔ جی ہاں! ایک طوائف دوسری طوائف کو قتل کرا سکتی ہے۔ آپ اکثر اخباروں میں پڑھتے ہیں گے کہ ایک طوائف قتل ہو گئی یا کسی طوائف پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ طوائفوں اور ناچنے گانے والوں کی دنیا جرم اور گناہ کی دنیا ہے۔ ان کے ہاں وہ لوگ جاتے ہیں جو ناچنا ہی

کے نہیں ہوتے۔ اگر آپ نفسیاتی نقطہ نگاہ سے دیکھیں تو طوائف اور ناپچنگانے والی اینارمل عورت ہوتی ہے۔ ایک تو ان کے گاہک ہوتے ہیں جو ان کے ہاں جاتے ہیں اور واپس آ جاتے ہیں۔ دوسرے تحصیلدار، دولہا اور اس کے باپ جیسے لوگ ہوتے ہیں جو ان کے چاہنے والے ہوتے ہیں۔ یہ اس لحاظ سے اینارمل ہوتے ہیں کہ جانتے ہوئے کہ بازار میں بیچی ہوئی پیشہ در عورت پیسے کی یار ہے کسی انسان کی نہیں اور یہ بڑا خوبصورت دھوکہ ہے یہ عشاق انہیں اپنا سمجھتے ہیں۔ ان کے ہاں جانے والے تیسرے لوگ جرائم پیشہ اور نامی گرامی غنڈے استاد اور بد معاش ہوتے ہیں۔ انہوں نے بھی ایک ایک بازاری عورت کو مجبور بنا رکھا ہوتا ہے۔ یہ لوگ رقابت کی تسکین چاقوؤں اور خنجروں سے کیا کرتے ہیں۔ یہ بھی نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ لہذا ابلیس کی اس منڈی میں خون خرابہ کوئی عجوبہ نہیں ہوتا۔

جہاں تک کیرتن کماری اور قربانی کی عداوت کا تعلق تھا، وہ بڑھتی گئی اور اس دولہا کی شادی کا وقت آ گیا۔ سازندوں کے بیان کے مطابق، یہاں بھی کیرتن کماری کو بلا گیا تھا مگر تحصیلدار نے اس کا سودا سوخ کر کے قربانی کی بات طے کرا دی۔ یہ ممکن تھا کہ کیرتن کماری نے اسی کو قربانی اور تحصیلدار کے قتل کا باعث بنایا ہو۔

محرم دولہا ہے یا کیرتن کماری؟

رات گزر چکی تھی۔ میرے اور راجیش کے لیے ناشتہ آ گیا۔ ناشتے کے بعد راجیش، دولہا کا باپ اور دہن کا باپ تھانے چلے گئے۔ وہ مجھے گفتیش کے

لیے ہمیں رکھنا چاہتے تھے۔ میں ان کے ساتھ نہ گیا۔ میں وہ گلہیں غور سے دیکھتا رہا جہاں دو انسان قتل ہو گئے تھے۔ مجھے وہاں سے کچھ نہیں مل سکتا تھا لیکن میں اپنی عادت پوری کرتا رہا۔

دو تینوں تھانے سے یہ خبر لے کر آئے کہ دونوں جاگیر داروں نے مجھے ہمیں رکھنے کے لیے میرے بالائی حکام سے اجازت لے لی ہے۔ میں اور راجیش الگ بیٹھ گئے اور جو کچھ ہمیں اس وقت تک معلوم ہوا تھا، اس پر بحث مباحثہ کرنے لگے۔ ہمارا ایک مشتبہ دولہا تھا۔ اس کے لیے ہمیں یہ معلوم کرنا تھا کہ آیا تحصیلدار نے اس کے باپ کو بتا دیا تھا کہ وہ قربانی کے ہاں جایا کرتا ہے؟ اس سوال کا جواب ہمیں کہاں سے مل سکتا تھا؟ تحصیلدار قتل ہو چکا تھا اور یہ ممکن نہیں تھا کہ دولہا اپنی زبان سے کہہ دے کہ اس کے دل میں تحصیلدار کے خلاف یہی دشمنی تھی۔

”اس کے باپ کو گھیرتے ہیں“ میں نے کہا۔ ”ہو سکتا ہے وہ بتا دے۔“

”نہ باپ سے پوچھتے ہیں نہ اس کے بیٹے سے۔“ راجیش نے کہا۔

”یہاں ان پر شک کا اظہار نہ کیا جائے۔ ہمیں یہ پتہ چل چکا ہے کہ قتل کرائے کے قاتلوں نے کیا ہے۔ ان میں سے ایک کا نام (نادر) بھی معلوم ہو گیا ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ وہ دلی کا سزا یافتہ بد معاش ہے اور اس کی ایک نشانی تو معلوم ہو گئی ہے کہ اس کی پنجھیں مروڑی ہوئی ہیں۔ ہمارا محرم دولہا ہے یا کیرتن کماری۔ میرے دماغ میں یہ آئی ہے کہ کرائے کے قاتل اپنا کام کامیابی سے کر چکے ہیں۔ اب وہ اپنا انعام وصول کرنے آئیں گے۔ بارات

کو جانے دیں۔ میرا زیادہ تر شک کیرتن کماری پر ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو پہلے اس شک پر کام کرتے ہیں۔ آپ بارات کے ساتھ واپس جائیں گے اور آپ ویسے پر بھی مدعو ہوں گے۔ وہاں کے ایس۔ این۔ او کو ساری واردات بتا کر ایک دو مخبر لے لیتا یا اپنے مخبر، ہاتھ رکھنا یا کوئی اور انتظام کر لیتا۔“

اُس نے ایک اور تجویز پیش کی۔ دتی اجیری گیٹ (بازار حسن) کے تھانے کا ایس۔ این۔ او درشن سنگھ اُس کا دوست تھا۔ دونوں نے اکٹھے ٹریننگ کی تھی۔ اس کے بعد بھی کچھ عرصہ اکٹھے رہے تھے۔ اُس نے کہا کہ وہ درشن سنگھ سے ٹیلیفون پر بات کرے گا اور اُسے کہے گا کہ کیرتن کماری کے کوٹھے پر نظر رکھے اور نادر کو پکڑنے کی یا اُس کا ٹھکانہ معلوم کرنے کی کوشش کرے۔

تجویز اچھی تھی۔ ہم دونوں تھانے چلے گئے۔ دتی کی کال جلدی مل گئی۔ فون پر درشن سنگھ مل گیا۔ بات راجیش نے کی۔ اُس نے میرا حوالہ بھی دیا اور اُسے مختصر واردات سنائی اور کہا کہ نادر نام کا ایک سزا یافتہ بد معاش کیرتن کماری کے گھر جا رہا ہے گا اور اُس کے ساتھ ایک اور آدمی ہوگا۔ انہیں پکڑنا ہے یا ان کا ٹھکانہ معلوم کرنا ہے۔

درشن سنگھ اس تھانے میں پُرانا ہو چکا تھا۔ اُس نے بتایا کہ وہ نادر کو جانتا ہے کیونکہ وہ تھانے کے ریکارڈ پر تھا۔ ایسے ہسٹری شیٹر تھانیداروں کو زبانی یاد ہوتے ہیں۔ درشن سنگھ کیرتن کماری کو بھی جانتا تھا۔ اُس نے میرے ساتھ بھی بات کی اور وعدہ کیا کہ وہ فوراً کارروائی کرے گا اور اس بات کو اطلاع دے دے گا۔

تحصیلدار نے مرتے وقت کچھ کہا تھا

میں نے تھانے سے آکر بارات کو جانے کی اجازت دے دی اور میں خود بھی ساتھ چل پڑا۔ دولہا اور دلہن کے باپوں نے مجھے کہا کہ میں نہ جاؤں۔ میں نے انہیں بتایا کہ تین تفتیش کے سلسلے میں ہی جا رہا ہوں۔ میں نے جھوٹ بولا کہ ایک شہرہ کو شامل تفتیش کرنا ہے۔ میں اب باراتی نہیں، جاسوس یا سراسر اڑساں تھا، یا مجھے راجیش کا مخبر کہہ لیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ بارات کے ساتھ کوئی نیا چہرہ تو شامل نہیں ہوا؟ بارات اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئی۔ یہ بھی میرا تھا۔ نہیں تھا۔ دوسرے دن ولیمہ تھا۔ میں نے کہیں سے مخبروں کا بندوبست کرنے کی بجائے خود دھڑے وہاں رُکے رہنا بہتر سمجھا۔ دولہا کے باپ سے کہا کہ میرا سر چکرا رہا ہے شاید رات بھر جاگنے کا اثر ہے۔ میں نے صورتِ مریضوں کی سہ بنائی۔ ان لوگوں نے میری تیمارداری میں حد ہی کر دی۔ مجھے بتا دیا لیکن میں باہر نکل کر لوگوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک ٹنگ شروع کر دی۔ کبھی کتا کہ دل گھبرا رہا ہے، ذرا باہر نکلوں گا۔ میں باہر نکل گیا۔

رات بھی اسی طرح گذاری۔ دیگیں پک رہی تھیں۔ ویسے کے انتظامات ہو رہے تھے اور میں گھوم پھر کر کسی کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے کھنی اور موڑی ہوئی مونچھوں والے بہت سے آدمی نظر آئے۔ وہ مونچھوں کا زمانہ تھا۔ کہا کرتے تھے کہ جس کی مونچھ نہیں وہ مرد ہی نہیں۔ آج کل نوجوانوں نے مونچھیں کھنی شروع

کردی ہیں لیکن یہ ہندوؤں کی طرح نیچے کو رکھی جاتی ہیں۔ ہماری جوانی کے وقتوں میں کہا جاتا تھا کہ مرد جان دے دیتا ہے مگر نیچے نہیں کرتا۔
 مونچھوں کے زمانے میں گھنی اور مروڑی ہوئی مونچھوں والے کسی خاص آدمی کو الگ کرنا بہت ہی مشکل تھا۔ اس کے باوجود میں نے سراغ رسانی کا کہاں دکھانے کی کوشش کی لیکن مجھے اپنی حماقت کا احساس ہونے لگا۔ دوسرے دن ولیمہ تھا۔ دولہا باہر آیا تو میں یہ ظاہر کیے بغیر کہ میری اُس پر نظر ہے، اُس کے ملنے والوں کو غور سے دیکھتا رہا اور اُس کی طرف پیٹھ کر کے اُس کی باتیں بھی سنتا رہا۔ میں نے وہاں اور کیا کچھ کیا، اس کی تفصیل خاصی طویل ہے لیکن یہ کارروائی احمقانہ تھی۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ راجیش نے جلد بازی میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ میں دولہا کے ساتھ رہوں۔ میں نے بھی سوچے سمجھے بغیر اُس کے کہنے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ولیمہ بھی ہرچکا تھا۔ مجھے نادر نظر نہیں آیا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ آیا ہو لیکن میں اُسے پہچانتا نہیں تھا۔ میں شام کی گاڑی سے واپس راجیش کے تھانے میں چلا گیا اور اُسے بتایا کہ ہمیں کچھ اور سوچنا پڑے گا۔ ہم نے سوچنا شروع کر دیا۔ بہت بحث مباحثہ کیا۔ تان درشن سنگھ پر ہی ٹوٹی تھی۔ وہ نادر کو جانتا تھا۔ اب میرا شک بھی کہیرتن کماری پر منتقل ہو گیا تھا۔ میں نے وائیس سے کہا کہ وہی چلتے ہیں اور درشن سنگھ کی مدد سے نادر کو گھیرنے کی ترکیب کرتے ہیں۔

یہاں میں آپ کو یاد دلادوں کہ مجھے کیوں یقین ہو گیا تھا کہ قاتل کا نام نادر ہے۔ اس کی وجوہات تو میں بیان کر چکا ہوں مگر ایک ثبوت بڑا واضح تھا میں سنا چکا ہوں کہ تحصیلدار نے مرتے وقت کچھ کہنے کے لیے ہرنٹ بلائے تھے۔

میں نے کان اُس کے ہونٹوں کے ساتھ لگا یا تو مجھے اُس کی سرگوشی سنائی دی تھی، لیکن وہ صرف ”نہ“ یا ”نا“ ہی کہہ سکا اور مر گیا۔ اس کے علاوہ اُس نے مونچھیں مروڑنے کا اشارہ کیا تھا۔ اُس وقت میں نہیں سمجھ سکا تھا کہ اُس نے کیوں ”نہ“ کہی ہے۔ جب گاڑی کے مسافروں نے بتایا تھا کہ سیٹی رنگ کے پاجامے اور کُرتے والے نے جو گیا رنگ کے پاجامے کُرتے والے کو نادر کہہ کر لپکا رہا تھا تو مجھے یاد آیا کہ مقتول نے نزع کے وقت ”نادر“ کہنا چاہا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مقتول نادر کو جانتا تھا۔

ہم دونوں نے فیصلہ کیا کہ دہلی چلا جائے۔

گھنی اور مروڑی ہوئی مونچھوں والا

ہم اگلی رات کو دہلی پہنچے اور سب انسپکٹر درشن سنگھ کے مہمان بنے۔ اُس نے بتایا کہ اُس نے ایک آدمی کو کیرتن کماری کے گھر پر نظر کھنے کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔ یہ ایک ہی روز پہلے کی بات تھی۔ رات درشن سنگھ کے ساتھ کچھ کام کی باتیں کرتے اور کچھ کپ شپ لگاتے گذر گئی۔ نادر کے متعلق اس نے بتایا کہ وہ چاقو زنی کا ماہر ہے اور اس نے دوسرائیں چاقو زنی میں اور ایک سزا قتل کے کیس میں اعانت جرم میں کاٹی ہے۔ درشن سنگھ نے بتایا کہ نادر قتل کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ درشن سنگھ نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ کیرتن کماری کے ساتھ نادر کا گہرا تعلق ہے۔

ان معلومات کے بعد یہ ضروری نہیں تھا کہ مخبر کو دہاں بٹھایا جاتا۔ اب سوچا یہ تھا کہ نادر پر براہ راست حملہ کیا جائے یا پہلے کیرتن کمار کی کوہلیٹ میں لیا جائے۔ ہمارے پاس اس بات کو ثبوت ہی نہیں تھا کہ قتل اگر نادر نے کیا ہے تو یہ کیرتن کمار نے کیا ہے۔ قتل دو لہا بھی کرا سکتا تھا۔ ہم تینوں نے اس اقدام پر تبادلہ خیالات کیا کہ نادر کے ٹھکانے پر چھاپہ مارا جائے۔ ہم نے اسی اقدام کو بہتر سمجھا اور طے ہوا کہ اگلے روز ایک مخبر یہ اطلاع لانے کے لیے مقرر کیا جائے کہ نادر اپنے ٹھکانے پر موجود ہے۔

ہم سو گئے۔ صبح درشن سنگھ نے نادر کی اطلاع لانے کے لیے ایک آدمی مقرر کر دیا۔ کچھ دیر بعد درشن سنگھ کا ایک ہیڈ کانسٹیبل جو کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا، تھانے میں آیا اور درشن سنگھ کو بتایا کہ جس آدمی کو کیرتن کمار کے گھر پر منظر رکھنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا وہ نادر کے ساتھ جا رہا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے انہیں دُور سے دیکھا تھا۔

درشن سنگھ گہری سوچ میں چلا گیا، پھر بولا۔ ”وہ آدمی نادر کے ساتھ جانا والا نہیں تھا، شاید کسی لالچ میں آ گیا ہو... اٹھو۔ مجھے کچھ شک ہو گیا ہے۔“ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ درشن سنگھ نے تین کانسٹیبل بھی ساتھ لے لیے۔ دو تانگے روک کر ہم ان میں بیٹھے اور حوض قاضی کی ایک گلی کے سامنے تانگے رُکوا کر اترے۔ درشن سنگھ بالکل خاموش تھا جیسے اُسے معلوم ہو کہ کیا ہونے والا ہے۔ وہ گلیوں کے موڑ پر تا ایک مکان کے سامنے رُکا۔ دروازے کو ہاتھ

لگایا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ وہ آگے چلا گیا اور تیسرے دروازے پر دھک دے کر دی۔ ایک آدمی نے دروازہ کھولا۔ اُس نے شکر اکر درشن سنگھ کو سلام کیا۔ درشن سنگھ نے کہا۔ ”ذرا دُور جانا ہے۔“ وہ آدمی یہ کہہ کر کہ آئیے، ایک طرف ہٹ گیا۔ ہم سب اندر گئے۔ ڈیوڑھی میں سیڑھیاں تھیں۔ ان سے اُپر گئے چھت سے ایک فصیل بچھلائی۔ آگے پھر چھت تھی۔ اس سے اتر کر درشن سنگھ سیڑھیاں اترنے لگا۔ ہم بھی اُس کے پیچھے اترے۔ یہ صحن تھا۔ ایک آدمی اندر سے دوڑتا باہر آیا۔ اُس کا منہ کھل گیا اور آنکھیں اُبل آئیں۔ اندر سے آواز آئی۔ ”کون ہے؟“ ”نادر ہے!“ درشن سنگھ نے بلند آواز سے جواب دیا۔ ”میں ہاں درشن سنگھ جہاں ہو میں رہتا۔“

درشن سنگھ نے روبرو رنگال لیا اور برآمدے میں داخل ہو کر ایک کمرے میں چلا گیا۔ ہم اُس کے پیچھے گئے۔ ”یہ ہے تمہارا نادر!“ درشن سنگھ نے ہمیں کہا۔ ”اور یہ جو فرش پر پڑا ہے یہ میرا آدمی ہے۔“

ہم اُسے سامنے گھٹی اور مروڑی ہوئی مونچھوں والا نادر کھڑا تھا اور ایک آنے می فرش پر اوڑھ بٹن پڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ پیچھے پیچھے رسی سے بندھے تھے اور اوّل بھی بندھے ہوئے تھے۔ نادر کے ہاتھ میں بید کی چھڑی تھی۔ درشن سنگھ نے کانسٹیبلوں سے کہا کہ اسے کھولو۔

”اگر میں اس کا دروازہ کھٹکھٹاتا تو اس آدمی کو یہ غائب کر دیتے۔“ درشن سنگھ نے کہا۔ ”میں اس مکان میں ایک بار پہلے بھی چھاپہ مار چکا ہوں۔“

میں نے راستہ بنا رکھا ہے۔“

نادر نے اُسے کہا کہ وہ ماں جانے کہ اُسے اُس (نادر) کے لیے بھیجا گیا ہے یہ آدمی نہیں ماں رہا تھا۔ اسے اور زیادہ مارا بیٹا گیا۔ اتنے میں ہم پہنچ گئے۔
”دیکھو نادر!“ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”وہ جو گیا رنگ کے کپڑے اور اپنے ساتھی کے سلیٹی رنگ کے کپڑے اور چاقو یا خنجر جو بھی تم نے استعمال کیا تھا، خود ہی نکال دو۔“

”ماں جانادرے!“ درشن سنگھ نے کہا۔ ”سوداگر ادول گا۔ موقع کے گواہ موجود ہیں۔ تم دونوں کو شناخت کر لیں گے۔“

”اُدھتھیلدار کا نرمی بیان بھی ہے۔“ راجیش نے کہا۔ ”اُس نے ہمارا نام لے کر بیان دیا تھا۔ پچاسی سے بچنا چاہتے ہو تو برآمدگی کرادو، ورنہ ہم خود تیرے یس گے تو ہماری تمہاری دوستی ختم ہو جائے گی۔ ہمارا جرم ثابت ہے پھر بھی رتی (سی۔ آئی۔ اے) کے حوالے کر دیں گے۔ تم جانتے ہو وہاں تمہارے ساتھ کس سلوک ہو گا۔ جسم پر کھال نہیں رہے گی، پھر سزا بھی پا جاوے گا۔“

وہ تھا تو یکا جرم پیشہ مگر تین تھانیداروں کے سامنے وہ بے بس ہو گیا۔
اُس پر ذرا سا بھی تشدد نہ کیا۔ ہم تینوں نے صرف زبان سے اُس سے ہتھیار ڈروا لیے۔ مجھے کتے تین چار آدمی بلا لیے۔ نادر نے اُن کے سامنے اپنا جو گیا سوٹ اور اپنے ساتھی کا سلیٹی سوٹ نکال دیا۔ معلوم ہوا کہ یہی آدمی جو اُس کے ساتھ تھا، دوہرے قتل میں اُس کا ساتھی تھا۔

مزید تلاشی میں دو بڑے کمائی دار چاقو اور دو خنجر برآمد ہوئے۔ چرس بھی برآمد ہوئی اور جامہ تلاشی میں نادر کی جیب سے اڑھائی ہزار کے نوٹ برآمد ہوئے۔

وہ تین تھانیداروں کے سامنے بے بس ہو گیا

یہ واقعہ یوں ہوا تھا کہ جہادی رستوں میں بندھا پڑا تھا، درشن سنگھ کا وہ مخبر تھا جسے اُس نے کیرتن کماری کے کوٹھے پر نظر رکھنے کے لیے مقرر کر رکھا تھا۔ طوائفوں اور ناچنے گانے والیوں کے ہاں رات کو رونق ہوا کرتی ہے۔ اس بازار میں اتنی بھیڑ ہوتی تھی کہ چلنے کا راستہ نہیں ملتا تھا۔ دن کے وقت وہاں آؤ بولا کرتے تھے۔ یوں کہیں کہ گناہوں کی اس دنیا کے دن سوئے اور راتیں جاگتی ہیں ماستاد جرم پیشہ عموماً دن کے وقت طوائفوں کے ہاں جایا کرتے تھے۔ مخبر نے بتایا کہ وہ صبح کے وقت اس بازار میں ٹہل رہا تھا کہ نادر کیرتن کماری کے گھر سے نکلا۔ نادر اکس مخبر کو جانتا تھا۔

نادر نے اُسے کہا کہ ایک ضروری کام ہے، ذرا ساتھ چلو یہ آدمی چونکہ نادر کے لیے میاں بھیجا گیا تھا، اس لیے وہ اس کے ساتھ چل پڑا۔ نادر اُسے اُس مکان میں لے آیا۔ یہاں ایک آدمی پیسے سے موجود تھا۔ دونوں نے اُس کے ہاتھ پاؤں رستوں سے باندھ دیے اور افندھے منہ کر کر اس سے پوچھنے لگے کہ وہ کل سے اس بازار میں کیا کر رہا ہے۔ نادر کو معلوم تھا کہ یہ آدمی پولیس کا مخبر ہے۔ اُس نے نادر سے کہا کہ وہ اپنے کام سے گھوم پھر رہا تھا۔

نادر نے اُس کی پیٹھ پر بید کی چھڑی اتنے زور سے ماری کہ وہ ملبل اٹھا۔

یہ تحصیلدار اور قربانی کے قتل کی اجرت تھی جو اس نے اسی صبح کیرتن کماری سے وصول کی تھی۔ اُس دور کے اٹھائی ہزار روپے آج کے پندرہ ہزار روپے کے برابر تھے۔

بارات کے ساتھ قاتل

اس قسم کے جرائم پیشہ کا پولیس کے جال سے نکلنا آسان نہیں ہوتا۔ ان دونوں کو ہم تھانے لے گئے۔ نادر چوہا اپنی دُنیا کا اُستاد تھا اس لیے اُس نے اقبال جرم کے عوض درشن سنگھ سے اپنے کسی پہلے کیس کا سودا کرنا چاہا۔ راجیش نے کیس کے متعلق پوچھا۔ درشن سنگھ نے بتایا تو راجیش نے اُسے کہا کہ نادر کو یہ انعام دے دو ضروری نہیں کہ میں آپ کو کیس سناؤں۔ مہٹری شیڈر افراد کے ساتھ بعض حالات میں اس قسم کی سودا بازی کرنی پڑتی ہے۔ میں نادر اور اُس کے ساتھی کی اس دہرے قتل کی واردات میں کوئی سودا بازی نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ مجھے اپنے تجربے پر اعتماد تھا کہ اتنی شہادت موجود ہے اور خانہ پُری کی بھی گنجائش ہے کہ ان دونوں کو سزا دلائی جاسکے۔ یہ کیس راجیش کا تھا۔ اُس نے جو بہتر سمجھا وہ کیا۔ نادر کا اقبالی بیان اُس کے ساتھی سے الگ لیا گیا۔ اُس کے جرم کسے داستان یوں ہے کہ کیرتن کماری کے ساتھ اُس کے گھر سے مرگم تھے۔ اس کلاس کی طوائفیں خصوصاً ناپنے گانے والیاں نادر کی طرح کے اُستاد و خندوں کو اپنی حفاظت اور اپنے کاروبار کے تحفظ کے لیے اپنے جال میں رکھتی ہیں اور ان کا ہر مطالبہ پورا

کرتی رہتی ہیں۔ وہ ایک دوسری پر اپنے اپنے خندوں کا رعب بھی کاٹھتی رہتی ہیں۔ کیرتن کماری نے نادر کو بتایا کہ قربانی اُس کے گاہکوں کو لے گئی ہے اور تحصیلدار اُس کی مدد اور نشت پناہی کر رہا ہے۔ اُس نے نادر کو وہی تفصیلات بتائیں جو میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ کیرتن کماری یہ چوٹ برداشت نہ کر سکی کہ ان جاگیرداروں کے لڑکے لڑکی کی شادی پر اُسے بلایا گیا تھا لیکن تحصیلدار قربانی کو لے گیا۔ اس شادی پر اُسے ہزار روپوں کی دیوں کی توقع تھی۔ اپنا معاوضہ الگ تھا۔ اس قسم کے دولت مندوں کے ہاں تو گانے والیاں بلا معاوضہ جانے کو بھی تیار ہو جاتی تھیں کیونکہ صرف وہیں اتنی ہو جاتی تھیں جو وہ کوٹھے پر پورے مینے میں نہیں کا سکتی تھیں۔

کیرتن کماری نے نادر پر شراب کا اور اپنے حسن و جوانی کا نشہ طاری کر کے ایسا بھڑکایا کہ وہ تحصیلدار اور قربانی کے قتل پر تیار ہو گیا۔ کیرتن کماری نے اٹھائی ہزار روپیہ نقد پیش کیا اور کہا کہ دونوں کو ختم کر آؤ اور رقم لے لو۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ یہ لوگ ذہنی مریض ہوتے ہیں اور انتہا پسند۔ ان کی سوچوں کو علم نفسیات کے ڈاکٹر ہی سمجھ سکتے ہیں۔

بارات گئی تو نادر اپنے ایک ساتھی کو ساتھ لے کر لڑکی والوں کے گاؤں چلا گیا۔ دونوں کے پاس خنجر تھے۔ نادر نے جو کیا کپڑے اور اُس کے ساتھی نے جس کا نام ذہن سے اُتر گیا ہے) سلیڈی رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ دونوں نے ادھر تہی چادریں لے رکھی تھیں اور فلیٹ شوژ پہنے تھے۔ وہ شام سے ذرا پہلے وہاں پہنچے۔ نادر نے اپنے بیان میں کہا کہ اُسے معلوم تھا کہ تھوڑی دیر تک اگر دُور

کے دیہات کے تماشائی جمع ہونے شروع ہو جائیں گے پھر ان دونوں کو کوئی نہیں پہچان سکے گا۔

ایسے ہی ہڑا۔ دونوں تماشائیوں میں شامل ہو گئے۔ نادر بہت چالاک آدمی تھا۔ اُس نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ قربانی کو کس کمرے میں ٹھہرایا گیا ہے۔ اُس کی نظر تحصیلدار پر بھی تھی۔ وہ ان دونوں کی نظروں سے بچنا چاہتا تھا کیونکہ دونوں اُسے جانتے تھے۔ تحصیلدار اُسے اس لیے زیادہ جانتا تھا کہ ایک بار وہ تحصیلدار سے ملا اور درخواست کے لیے جسے میں اُسے کہا تھا کہ وہ کیرتن کماری کے کاروبار کو تباہ نہ کرے تحصیلدار نے اُسے ڈانٹ دیا اور کہا تھا ”کیرتن کماری مجھے غنڈہ دل سے ڈرا رہی ہے؟“

”میں غنڈہ بن کے نہیں آیا حضور!“ نادر نے کہا تھا۔ ”ایک عرض کئے آیا ہوں“ تحصیلدار نے حاکمانہ لہجے میں ہی باتیں کیں تب نادر نے اُسے کہا۔ ”اگر حضور یہ چاہتے ہیں کہ میں غنڈے کے روپ میں جناب کے سامنے آؤں تو کسی دن آجاؤں گا۔“

”میں نہیں دس مقدموں میں پھانس کر ساری عمر کے لیے جیل بھجوا دوں گا“ تحصیلدار نے کہا تھا۔

نادر اُسے یہ کہہ کر چلا آیا تھا۔ ”پہلے علاقے کے ڈی۔ ایس۔ پی سے بات کر لیتا۔“

قربانی قاتلوں کو دیکھ کر اٹھی

شادی کی تقریب میں نادر نے قربانی کو بھی دیکھا اور تحصیلدار کو بھی۔

اس کا ساتھی بھی دونوں کو جانتا پہچانتا تھا۔ نادر نے ابھی یہ نہیں سوچا تھا کہ انہیں کہاں قتل کرے گا۔ یہ موقع محل کے مطابق تھا۔ قربانی دو چار گانے سن کر حویلی کے اندر چلی گئی۔ نادر اور اُس کا ساتھی بھی اُدھر گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ حویلی کا یہ حصہ شارع عام بنا ہوا تھا۔ دیہاتی تماشائی قربانی کو قریب سے دیکھنے کے لیے حویلی کے اندر چلے گئے تھے۔ نادر بھی اپنے ساتھی کے ساتھ اندر چلا گیا اور دونوں اُس کمرے تک چلے گئے جو قربانی کو دیا گیا تھا۔

قربانی کو ان کے ہاتھوں مرنا تھا۔ تماشائی جو اندر آ گئے تھے، بائی کے کمرے کا دروازہ بند ہوتے دیکھ کر چلے گئے۔ نادر اور اُس کا ساتھی بھی پیچھے ہٹ آئے اور قربانی کی ناکھ اور سارے بدن بھی باہر چلے گئے۔ قاتلوں کے لیے میدان خالی ہو گیا۔ دونوں قاتل اندر چلے گئے۔ قربانی انہیں دیکھ کر اٹھی۔ نادر باہر خنجر زن تھا۔ اُس نے قربانی کے پیٹ میں خنجر مار کر ایک طرف کو جھٹکا دیا اور اُس کے ساتھی نے اُس کے دل پر خنجر مارا۔ قربانی کی آواز نہ لگی اور وہ گر پڑی۔ دونوں باہر نکل گئے۔

دونوں نے طے کر رکھا تھا کہ اگر وہ الگ الگ ہو گئے تو ایک دوسرے کا انتظار ساتھ والے سبزیوں کے باغ کے باہر کریں گے۔ انہوں نے جگہ مقرر کر رکھی تھی۔ قربانی کو قتل کر کے دونوں باہر آ گئے۔ اُس کا ساتھی لاپتہ ہو گیا۔ اُس نے اپنے اقبالی بیان میں کہا تھا کہ اُس میں دوسرے قتل کی ہمت نہیں رہی تھی، اس لیے وہ وہاں سے کھسک گیا اور سبزیوں کے باغ کے باہر مقررہ جگہ چلا گیا۔ اُدھر نادر دیکھتا رہا کہ اب کیا ہو گا اور کیا وہ تحصیلدار کو قتل کر سکے گا؟

تھوڑی ہی دیر بعد قتل کا انکشاف ہو گیا اور حویلی کے اندر ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ نادر نے تحصیلدار پر نظر رکھی۔ وہ اندر گیا تو نادر بھی اندر چلا گیا۔ برآمدے میں روشنی کم تھی اور ہجوم زیادہ۔ نادر نے سامنے سے آکر خیر جو اُس نے چادر میں چھپا رکھا تھا، تحصیلدار کے پیٹ میں پھیر دیا۔ تحصیلدار نے نادر کا چہرہ دیکھ لیا اور خیر کھا کر بولا۔ ”اُونے نادر سے ایہ کیا؟“ اور وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر آگے کو گرا۔ سب سے پہلے نادر نے بلند آواز سے کہا۔ ”اُوے اسے دیکھو کیا ہو گیا؟“ جب ہجوم اور صحتو جھڑا تو نادر اور دھڑ دھڑ ہو گیا۔ وہ وہاں سے فوراً نکل جاتا چاہتا تھا مگر ہجوم جس کی صورت دریا میں مجتور جیسی ہو گئی تھی، اُسے پیچھے کو اور اور دھڑ دھڑ چھکیل رہا تھا۔ وہ جلدی نکل نہ سکا۔ اتنی دیر میں اعلان ہوا کہ جو ہاں کھڑا ہے وہیں بیٹھ جائے۔ نادر نے دروازہ بند ہوتے دیکھا۔ ہجوم بیٹھ گیا۔ نادر کو لگتا تھا اُس کے پاس خون آلود خیر تھا اور اُس نے اپنا جائزہ تو نہیں لیا تھا لیکن اُسے ڈر تھا کہ اُس کے کپڑوں پر خون کے چھینٹے ہوں گے۔ اُس نے چادر اسی مقصد کے لیے لے رکھی تھی۔

اُس نے جب دیکھا کہ وہ دروازے میں سے گزرتے پکڑا جائے گا تو اُس نے بیٹھے بیٹھے کوئی اور راستہ دیکھنا شروع کر دیا۔ اُسے نیم کا درخت اور دیوار تک گیا ہوا ٹھن نظر آیا۔ وہ اٹھا اور نہایت تیزی سے درخت پر چڑھ گیا۔ اُس نے شور بھی مٹا۔ ”وہ گیا۔ وہ گیا۔“ وہ بلی کی طرح ٹپ ٹپ کر گیا۔ باہر کو گودا گودوں سے نکل گیا۔ سبز بولیوں والے باغ سے گزرا۔ اُس کا ساتھی اُس کا انتظار کر رہا تھا اینٹوں نے معلوم کر لیا تھا کہ رات کو ایک مسافر گاڑی گزرتی ہے۔ وہ دونوں ریل سے

سٹیشن پہنچے اور گاڑی آگئی۔ وہ انجن سے ذرا ہٹ کر کھڑے رہے۔ گاڑی چلی تو وہ پہلے ڈبے پر سوار ہو گئے۔

گاڑی جب میرے کنبے پر ایک سٹیشن پر زیادہ دیر رُک رہی تو انہیں شک ہوا۔ وہ بہت محتاط تھے۔ وہ دیکھ چکے تھے کہ اُن کے کپڑوں پر خون کے چھینٹے پڑے ہوئے ہیں۔ انہیں چھپانے کے لیے انہوں نے چادریں اور نیچے لٹکائیں۔ نادر کے ساتھی نے دیکھا کہ پولیس آ رہی تھی۔ اُس نے نادر کو بتایا۔ دونوں دوسری طرف اُتر گئے اور پیدل سات اٹھ میل چل کر اپنے ایک دوست کے ہاں پہنچے۔ اُس کے ہاں انہوں نے کپڑوں سے خون دھویا اور خیر صاف کیے۔ رات وہاں گذاری اور اگلی شام دہلی پہنچے۔

نادر رات کو کیرتن کمار کی ہاں نہ گیا کیونکہ رات کو وہ مصروف ہوتی تھی۔ وہ رات کے آخری پہر گیا۔ کیرتن کمار کی کو کامیابی کی خوشخبری سنائی۔ اڑھائی ہزار وصول کیا۔ کچھ دیر وہاں سویا اور جب باہر نکلا تو اُسے درشن سنگھ کا مخبر نظر آیا۔ اُس کے انداز سے اُسے شک ہوا۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو اُسے مخبر پر شک نہ ہوتا۔ وہ نادر تھا جو اپنے فن کا ماہر اور اُستاد تھا اور پولیس کی کارروائیوں کو اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اُس نے مخبر کے ساتھ دوستانہ پیار سے باتیں کیں اور اُسے کسی کام کے بہانے اپنے ساتھ لے گیا۔ اپنے گھر لے جا کر اُس نے مخبر کے ساتھ جو سولہ کیا وہ آپ کو سنا چکا ہوں۔

اس کے ساتھی نے الگ اقبالی بیان دیا۔ دونوں کے بیانوں میں کچھ فرق تھا جو ہم نے پُر کر لیا۔ دونوں نے مخبر ٹریٹ کو بھی بیان قلمبند کرا دیے۔ ہم

نے کیرن کماری کو بھی گرفتار کر لیا۔ میں اپنے بھانے میں چلا گیا۔ میرا کام ختم ہو چکا تھا۔ راجیش طرزمول کو اپنے ساتھ لے گیا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں کہ وہ ذہین آدمی تھا۔ مقدمہ تیار کرنا جانتا تھا۔ مجھے اطلاع ملتی رہی۔ نادر اور اُس کا ساتھی میٹن کورٹ میں جا کر اقبالی بیازوں۔ یہ خوف ہو گئے لیکن راجیش نے کوئی خانہ خانی نہیں رہنے دیا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ نادر جیسے اُستاد عدالت میں جا کر اپنی چال چلا کرتے ہیں۔ اس کا اُس نے اپنے گواہوں کے ذریعے پورا بندوبست کر رکھا تھا۔ نادر اور اُس کے ساتھی کو سزائے موت دی گئی اور کیرن کماری کو چار سال سزائے قید ملی۔ اُس نے روپے پیسے کے زور پر بڑا قابلِ وکیل کیا تھا مگر وہ انہیں سزا سے بچانہ سکا۔ اُن کی اپیلیں بھی مسترد ہو گئیں۔



پیلار و مال لال سرت سرنی اکال

چوری جسے پولیس کی زبان میں سرورہ کہتے ہیں، معمولی سی واردات سمجھی جاتی ہے۔ تھانوں میں چوری کی وارداتوں کی رپورٹیں ہر روز آتی اور اکثر کاغذوں میں ہی دفن ہو جاتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ چوری کو معمولی سی واردات سمجھ کر اس کی تفتیش میں دلچسپی نہیں لی جاتی بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ سب سے زیادہ مشکل تفتیش جس واردات کی ہے، وہ سرورہ ہے۔ قتل ایک گھناؤنا اور ہولناک جرم ہے لیکن تھانیدار تجربہ کار اور اپنے فرائض میں دلچسپی لینے والا ہو تو قتل کی تفتیش مشکل نہیں ہوتی۔ البتہ قتل کے ساتھ ایک کہانی وابستہ ہوتی ہے اور چوری صرف چوری ہوتی ہے۔

چوری کی سزائیں سے ایک واردات ایسی ہوتی ہے جس کے پیچھے ایک ڈرامہ ہوتا ہے۔ ایسی ہی ایک واردات کی تفتیش پیش کرتا ہوں۔ وہ گاؤں خاں صاحبڑا تھا۔ آبادی چار ہزار نفوس سے زیادہ ہو گی۔ اس میں ہندو، سکھ اور مسلمان آباد تھے۔ مسلمانوں کی تعداد بھٹوڑی تھی۔

اس علاقے کی زمین زرخیز تھی۔ دُور دُور تک فصلوں کی ہر بالی نظر آتی تھی۔ یہ گاؤں تنھانے سے دوڑھاتی میل دُور تھا۔ ایک سکھ جو شکل و صورت اور لباس سے معزز لگتا تھا، تنھانے میں آیا۔ اُس کے ساتھ نمبر دار بھی تھا اور چوکیدار بھی۔ سکھ کا نام دربار سنگھ تھا، پانچ سات جینے گورے صوبیداری پٹن پر گھر آیا تھا۔ اُس کی زمین داری دربار سے پیمانے کی تھی۔

اُس نے رپورٹ لکھوائی کہ اُس کے گھر سے ڈیڑھ ہزار روپیہ چوری ہو گیا ہے۔ یہ خاص طور پر نوٹ کر لیا کہ یہ اچھے وقتوں کا واقعہ ہے جب ڈیڑھ ہزار روپیہ آج کے ڈیڑھ لاکھ روپے کے برابر ہوتا تھا۔ ڈیڑھ ہزار کسی بڑے ہی امیر آدمی کے گھر میں ہوتا تھا۔

میں نے اُس سے وہ سب باتیں پوچھیں جو چوری کی رپورٹ پر پوچھی جاتی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ نقب لگی ہوگی یا گھر والے گھر نہیں ہوں گے اور نالہ لوٹا ہوگا مگر یہاں بات ہی کچھ اور نکلی۔ رقم جو دس اور پانچ روپے کے نوٹوں کی شکل میں تھی، ایک ٹرنک میں کپڑوں کے نیچے ایک کپڑے میں بندھی رکھی تھی۔ ٹرنک کا تالہ نہیں توڑا گیا تھا۔ اس کے پیچھے دو قبضے تھے، وہ اکھاڑے گئے تھے۔ ٹرنک کے نیچے ایک اور ٹرنک اور اس کے اوپر دو چھوٹے صندوق تھے۔ یہ سب فریضے سے رکھے ہوئے تھے۔

سکھ صوبیدار کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ چوری کب ہوتی۔ سکھ کی بیوی نے ٹرنک کا تالہ کھولا تو اس کا ڈھکنا الگ ہو گیا۔ دیکھا کہ پیچھے سے قبضے اکھڑے ہوتے ہیں۔ سکھ کی بیوی کو فوراً رقم کا خیال آیا۔ کپڑے اٹھا

کر دیکھا۔ رقم غائب تھی۔ لہذا یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ رقم کب چوری ہوئی۔

”اس سے پہلے آپ نے یہ ٹرنک کب کھولا تھا؟“

”مجھے جواب تو میری بیوی دے سکتی ہے۔“ سکھ نے کہا۔ ”جہاں ٹرنک مجھے معلوم ہے، یہ ٹرنک آٹھ دس روز پہلے میری بیوی نے کھولا تھا۔“

”اُس روز رقم ٹرنک میں موجود تھی؟“

”مجھے معلوم نہیں۔“

”کیا ان آٹھ دس دنوں میں آپ کے گھر کے تمام افراد کبھی گھر سے یا گاؤں سے باہر گئے تھے؟“

”تین روز گزرے ہم اپنی بڑی بیٹی کے گھر گئے تھے۔“ سکھ صوبیدار نے جواب دیا۔ ”گھر کو تالہ لگا کر گئے تھے۔“

اُس نے تفصیل یہ بتائی کہ اُس کی ایک بیٹی گاؤں میں ہی شادی شدہ ہے۔ اُس کے ہاں بچہ پیدا ہوا تھا۔ سکھ، اپنی بیوی اور ایک غیر شادی شدہ بیٹی کے ساتھ اپنی بڑی بیٹی کے گھر گیا تھا۔ وہ دوپہر تک وہاں رہے۔ اندر بڑے کمرے کو تالہ لگا دیا تھا۔ ڈیوڑھی کے اندرونی دروازے کو بھی تالہ لگا دیا تھا اور باہر والے دروازے کی زنجیر چٹھا دی تھی۔ دیہات میں ڈاکے پڑا کرتے اور نقب لگا کرتی تھی، دن دھاڑے چوری کم ہی ہوتی تھی۔ یہ لوگ واپس آتے تو باہر زنجیر چٹھی ہوتی تھی اور اندر کے دونوں دروازوں پر تالے لگے ہوتے تھے۔

”گھر میں کون کون ہے؟“

دونوں کے چال چلن کی تعریف کی اور چوکیدار نے نمبر دار کی تائید میں بہت کچھ کہا۔

میں اتنا سمجھ گیا کہ چوری کچھ دن پہلے ہوتی ہے اور انہیں آج پتہ چلا ہے۔ جاتے واردات پر مجھے اب کوئی کھڑا کھوج نہیں مل سکتا تھا۔ تاہم وہاں جانا ضروری تھا۔ میں کاغذی کارروائی مکمل کر کے سکھ صوبیدار کے ساتھ چل پڑا۔

تالے نہیں ٹوٹے

مکان پٹکا تھا۔ اس کے دائیں بائیں مکان تھے اور پچھوڑے کے مکانوں کے پچھوڑے ان سے ملے ہوئے تھے۔ سکھ کے کان کی ڈیوڑھی تھتی۔ آگے صحن۔ باقی تین اطراف برآمدے اور کمرے۔ سکھ مجھے ایک بڑے کمرے میں لے گیا۔ اس کے دائیں اور بائیں کونٹریوں کی طرح کے دو چھوٹے کمرے تھے۔ ایک چھوٹے کمرے میں ٹرنک رکھے تھے اور بہت سا دوسرا سامان بھی تھا۔

جس ٹرنک سے رقم چوری ہوتی تھی وہ وہیں پڑا تھا۔ پُرانے زمانے سے بھی پہلے کا ٹرنک تھا۔ اس کے پیچھے دو قبضے لگے ہوتے تھے جو زنگ غورہ تھے۔ انہیں کسی مضبوط آؤزار سے اکٹھا کر لیا تھا۔ میں نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ میں نے سوچا تھا کہ چوری گھر کے کسی فرد

سکھ صوبیدار اور اس کی بیوی کے علاوہ ان کے دو بیٹے تھے۔ دونوں جوان تھے لیکن غیر شادی شدہ اور ایک ان کی بہن تھی جس کی عمر اٹھارہ انیس سال تھی۔ اُس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی۔ گھروں میں بعض اوقات گھر کا ہی کوئی فرد چوری کر لیا کرتا ہے۔ مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ صوبیدار کے دونوں بیٹے کس قماش کے ہیں۔ میں نے یہ کہنا مناسب نہ سمجھا کہ اُس کے بیٹوں پر مجھے شک ہے۔ اس کا بھاتے ہیں نے اُس سے پوچھا کہ اس کے بیٹے کیا کرتے ہیں۔ اُس نے بتایا کہ زمین زیادہ ہے۔ دونوں بیٹے مراٹھوں اور کھیتوں کی دیکھی بھال کرتے اور خود بھی کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ سکھ کچھ عقل والا معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے خود ہی کہہ دیا۔ ”میں نے پچیس سال فوج کی سروس کی ہے۔ میں سیدھی بات کرنے کا اور کسی کا لحاظ نہ کرنے کا عادی ہو گیا ہوں۔ مجھے پہلا شک اپنے لڑکوں پر تھا لیکن میرا شک غلط نکلا۔ اُن میں کوئی بری عادت نہیں۔ شراب تو ہر کوئی پیتا ہے۔ اُن میں کوئی عیب نہیں جو انہیں کھیلنے شہر بھی نہیں جاتے۔“ میں نے اُس کے بیٹوں کے متعلق بات آگے نہ بڑھائی۔ اُن کی میچ رپورٹ مجھے مجبوروں سے یعنی تھی۔ میں نے اُسے کہا کہ وہ ایک بار پھر سوچ لے۔ اگر رپورٹ درج ہوگئی، ایف۔ آئی۔ آر تحریر ہوگئی اور پتہ چلا کہ چوری اُس کے بیٹوں نے کی ہے تو انہیں سزا ملے گی۔ اُس نے کہا کہ میں رپورٹ رجسٹر کر لوں۔ نمبر دار نے پُر زور انداز سے کہا کہ صوبیدار کے لڑکے ایسے نہیں کہ اپنے گھر کو ہی لوٹ کھائیں۔ اُس نے

نے کی ہے تو آواز یہیں کہیں ہوگا، لیکن مجھے ایسی کوئی چیز نظر نہ آتی۔ یہ بات بالکل صاف تھی کہ چور جو کوئی بھی ہے، اُسے معلوم تھا کہ رقم اس ٹرنک میں ہے اور کپڑوں کے نیچے رکھی ہے۔ میں نے سکھ صوبیدار سے پوچھا کہ جب اُس کی بیوی نے یہ ٹرنک کھولا تو اس میں رکھے ہوئے کپڑوں کی کیا حالت تھی؟

”بالکل ٹھیک پڑے تھے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میں نے خود دیکھے تھے۔“

اس کا مطلب یہ ہوا کہ چور کو رقم تلاش کرنے کے لئے کپڑے باہر نکالنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اگر چور باہر کا کوئی آدمی تھا تو اُس نے واردات گھر بھید کی مدد سے کی ہے۔ گھر بھیدی وہی ہو سکتا یا ہو سکتی تھی جس کا عمل دخل اس اندرونی کمرے تک تھا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ٹرنکوں وغیرہ کی انچارج گھر کی غورت ہوا کرتی ہے۔ چابیاں اُسی کے پاس رہتی ہیں، اس لئے میں نے صوبیدار کی بیوی سے تفتیش کی ابتدا بہتر سمجھی۔ اس سے پہلے میں نے مکان کی میٹرٹھیاں اور ان کا دروازہ دیکھا۔ اوپر گیا۔ چھت دیکھی۔ ملحقہ مکانوں کی چھتوں سے ادھر آ یا جاسکتا تھا۔ نمبر دار، سکھ صوبیدار اور ذلیلدار میرے ساتھ تھے۔

میں نے ملحقہ گھر انوں کے متعلق پوچھا تو تینوں نے متفقہ طور پر کہا کہ سب شریف لوگ ہیں۔ میں نے اُن سے تو کچھ نہ کہا، اپنے طور پر سوچا کہ ضروری نہیں ہوتا کہ شریف لوگوں کی اولاد بھی شریف ہی ہو۔ بہر حال مکان

ایسا تھا کہ چور اوپر سے آ اور جاسکتا تھا۔ میں نے سکھ کی بیوی کو الگ بٹھالیا۔ چابیاں اس کی تحویل میں رہتی تھیں۔ گاؤں کے لوگ روپیہ پیسہ گھروں میں ہی رکھا کرتے تھے اس لئے چابیاں ایسی جگہ رکھتے تھے جہاں توقع ہی نہیں ہوتی تھی کہ چابیاں ہوں گی۔ یہ عورت ایک پرانی ہانڈی میں چابیاں رکھتی تھی جس میں مسور کی وال پٹری رہتی تھی۔ تین ہانڈیاں اس کے اوپر رکھی رہتی تھیں۔ کسی ہانڈی میں کڑا اور کسی میں ہلدی اور کسی میں ایسی ہی کوئی اور چیز تھی۔ یہ تو معلوم ہو چکا تھا کہ ٹرنک کا تالہ نہیں ٹوٹا، ڈھکنا اکھاڑا گیا ہے۔ ڈھکنا اکھاڑنے کے لئے وقت درکار تھا اور اس سے آواز بھی پیدا ہوتی تھی، اس لئے چوری رات کو کی گئی ہوگی جب گھر والے معن میں سوتے ہوئے ہوں گے یا اُس وقت جب گھر کوئی بھی نہیں ہوگا۔

صوبیدار کی بیوی نے یہ بتا کر مجھے اُلجھن میں ڈال دیا کہ نیچے والے ٹرنک میں زلیورات تھے جو لڑکی اور اُس کے دونوں بھائیوں کی شادیوں کے لئے بنوائے گئے تھے۔ میں کہتا تھا کہ چوری کسی گھر بھیدی کی مدد سے کی گئی ہے۔ اب میں اس اُلجھن میں پڑ گیا کہ گھر بھیدی کو اگر اس رقم کا علم تھا تو کیا اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے نیچے زلیورات بند ہیں؟

اُسے ضرور معلوم ہوگا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ چور کو صرف رقم کی ضرورت تھی۔ اگر وہ چوری کے ارادے سے آتا یعنی جو ہاتھ لگا اٹھا لے جانے کے لئے آتا تو دوسرے ٹرنک بھی کھولتا۔ دوسرے ٹرنک نہ کھولنے

کی ایک وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ کوئی جاگ اُٹھا ہو گا یا کوئی باہر سے آ رہا ہو گا۔
میں نے تھانے میں صوبیدار سے جو باتیں پوچھی تھیں، وہ اس
کی بیوی سے بھی پوچھیں۔ اُس نے بھی بتایا کہ آٹھ دس روز پہلے ٹرنک
کھولا تھا اور رقم موجود تھی۔ آج صبح کھولا تو رقم غائب پائی۔ رقم ریشمی رومال
میں بندھی ہوئی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ رومال کی کوئی خاص نشانی
ہے؟ اُس نے بتایا کہ رومال پہلے رنگ کا ہے اور اس کے درمیان
میں اُس کی چھوٹی بیٹی نے لال دھاگے سے گور کھی ہیں ”ست سری اکال“
کا ٹھا ہوا ہے۔

گھر میں ایک نوکرانی تھی۔ وہ ادھیڑ عمر تھی اور ایک جوان آدمی گھر کے
کام کاج کے لئے بھی آتا تھا۔ وہ دراصل مزارع تھا۔ سکھ کی بیوی نے ان
کے متعلق کہا کہ دونوں مرے بیٹے سے ہیں اور ہر لحاظ سے قابل اعتماد۔
اُس نے کہا کہ وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ کون
سے ٹرنک میں کیا رکھا ہے۔

”تم نے آٹھ دس دن پہلے ٹرنک کھولا تھا یا آج کھولا ہے۔“
میں نے پوچھا۔ ”اس دوران تم سب لوگ کسی دن گھر سے باہر
گئے تھے؟“

”تین دن گزرے اپنی بڑی بیٹی کے گھر گئے تھے۔“ اُس نے
جواب دیا۔ ”میں گئی تھی۔ اجیت کور (چھوٹی بیٹی) ساتھ تھی اور اس
کا بالو (صوبیدار) بھی ساتھ تھا۔ ہم صبح گئے اور دوپہر کے بعد واپس آئے تھے۔“

”تمہارے دونوں بیٹے نہیں گئے تھے؟“
”وہ کھیتوں کو چلے گئے تھے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”آپ دیکھ
رہے ہیں، کشتی ہو رہی ہے۔“

”گھر کون رہا تھا؟... نوکر اور نوکرانی؟“
”نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”گھر کو تالے لگا کر گئے تھے۔“
”تالے کہاں کہاں لگاتے تھے؟“

”ایک اس بڑے کمرے کو۔“ اُس نے کہا۔ ”دوسرا ڈیوڑھی
کے اندرونی دروازے کو، اور ڈیوڑھی کے باہر والے دروازے کی
باہر سے زنجیر چڑھا دی تھی۔ وہاں تالہ لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔
کوئی کھول بھی لے تو ڈیوڑھی سے اندر آنے کا کوئی راستہ نہیں۔“
”جب تم لوگ واپس آتے تو تالے لگے ہو تے تھے؟“ میں نے
پوچھا۔ ”نہیں کوئی شک نہیں ہوا؟“
”لگے ہو تے تھے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے کچھ بھی
شک نہیں ہوا۔“

میں نے دونوں تالے منگوا کر دیکھے۔ ان پر ایسا کوئی نشان نہیں
تھا جو ظاہر کرتا کہ یہ تالے سلاخ سے یا کسی اوزار سے کھولے گئے ہوں۔
اگر اس طرح کھولے جاتے تو پھر بند نہ ہوتے۔ صوبیدار کی بیوی نے کہا تھا
کہ اُس نے واپس آکر دیکھا۔ تالے بند تھے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ تالے اسی قسم
کی دوسری چابیوں سے کھولے گئے پھر لگا دیئے گئے ہوں۔

شبہ بیٹی پر بھی

میں نے سوچا کہ تامل، سلاح وغیرہ سے کھولے جاتے تو چور ٹرنک کا تالہ بھی کھول لیتا۔ چور نے ڈھکن کیوں اکھاڑا ہے؟ مجھے شک ہونے لگا کہ چور اسی گھر میں ہے اور تاملے کھولنے کے لئے دوسری چابی استعمال کی گئی ہے۔ میں نے اشاروں اشاروں میں سکھ کی بیوی سے معلوم کرنا چاہا کہ یہ کارستانی اُس کے کسی بیٹے کی ہو سکتی ہے۔ معلوم نہیں وہ میرے اشارے سمجھ سکی یا نہیں، البتہ اُس نے ایسی باتیں کیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُسے اپنے بیٹوں پر شک نہیں۔ مجھے یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ چوری اسی روز ہوتی ہے جس روز یہ لوگ اپنی بڑی بیٹی کے گھر گئے تھے۔

”ان تالوں کی دوسری چابیاں بھی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔
 ”دونوں تالوں کی ہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”ٹرنک کے تالے کی نہیں؟“

”وہ اسی گھر میں ہیں؟“

”نہیں۔“ اُس نے بتایا۔ ”میں چار تالوں کی دوسری چابیاں الگ گچھے میں ہیں۔ اجیت کو رکے باپو نے ایک بار کہا تھا کہ ہرنالے کی دوسری چابی الگ رکھنی چاہیے۔ ایک ہی گچھے میں تمام چابیاں ہوں اور

گچھا گم ہو جائے تو دوسری چابیاں بھی ساتھ ہی جاتی ہیں، پھر تاملے توڑنے پڑتے ہیں۔“

سکھ چونکے جبیس سال فوج میں رہا تھا اس لئے عقل کی بات کرتا تھا۔ میں نے اُس کی بیوی سے پوچھا کہ دوسری چابیاں کہاں ہیں۔ اُس نے بتایا کہ ایک سوٹ کیس میں رکھی ہیں۔ میرے کہنے پر وہ چابیاں لے آئی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ یہ اُسی جگہ رکھی تھیں جہاں ہونی چاہتیں تھیں یا ادھر ادھر تھیں؟ اُس نے بتایا کہ جہاں رکھی رہتی تھیں، وہیں تھیں۔ میں نے چابیوں کو غور سے دیکھا لیکن ان سے مجھے کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ چابیاں تو مجھے کچھ بھی نہیں بتا سکتی تھیں۔

میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ وہ جتنی دیر اپنی بڑی بیٹی کے گھر رہی، چابیاں اُسی کے پاس رہیں۔ وہ ذرا سوچ کر بولی۔ ”نہیں۔ کچھ دیر بعد چابیوں کا گچھا اجیت کو رنے لے لیا تھا اور اُسی کے پاس رہا تھا۔“

”اُس نے کیوں لے لیا تھا؟“

”میں نے گچھا چار پاتی پر رکھ دیا تھا۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”میں عورتوں کے ساتھ بائیں کرتے ادھر ادھر ہو گئی اور گچھا وہیں پڑا رہا۔ اجیت کو رنے دیکھ لیا اور مجھے ذرا غصے سے کہا کہ تم چابیاں گم کر دو گی۔ میں اپنے پاس رکھتی ہوں۔“

اگر میں آپ سے کہوں کہ مجھے اجیت کو ر پر شک ہے کہ تم اُس نے

چراتی ہے تو آپ یقین نہیں کریں گی کہ بیٹی اپنے ہی گھر چوری کر سکتی ہے۔ آپ پولیس کا ریکارڈ دیکھیں۔ آپ حیران رہ جائیں گے کہ بعض بیٹیوں نے اپنے زلیخات چاکر آزمائیں دے دیتے جنہیں وہ چاہتی تھیں۔ ان لڑکیوں کے دل کہیں اور تھے اور ان کے ماں باپ ان کی شادی کہیں اور کر رہے تھے۔ ایسے تین کیسوں کی میں نے بھی تفتیش کی تھی۔

مجھے تو ہر کسی پر شک نہ تھا۔ اس لڑکی پر میرا شک ابھی بچہ نہیں تھا۔ تاہم میں نے ذہن میں اُسے شامل تفتیش کر لیا۔ میں کسی بھی امکان کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔

”کہیں کسی پر شک ہے؟“

”نہیں۔“ اُس نے کہا۔ ”ہماری کسی کے ساتھ دشمنی نہیں۔“

سکھ لڑکی اور شرمیلی؟

اُسے بھیج کر میں نے اجیت کو روک لیا۔ وہ خوبصورت لڑکی تھی سکھوں کی لڑکیاں شرمیلی نہیں ہوا کرتیں۔ دیہاتی سکھ ماؤں بہنوں کی موجودگی میں ننگی باتیں کرتے اور گالیاں بکتے رہتے ہیں۔ اُن کا مکینہ کلام عموماً گالیاں ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ان کی عورتیں بھی ننگی باتیں کرتی ہیں کنواری لڑکیاں بہت شوخ ہوتی ہیں اور ان میں حیا نہیں ہوا کرتی۔ اجیت کو ران سے مختلف تھی۔ اُس نے دوپٹہ اس طرح اوڑھ رکھا تھا کہ ماتھا بھی ڈھکا ہوا تھا،

یعنی اُس نے دوپٹے کی بکسل مار رکھی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ وہ ماتھا نیدار سے ڈری ہوتی تھی، لیکن اس ڈر میں شرم اور حیا صاف نظر آرہی تھی۔ اگر میں چہرہ شناسی میں غلطی نہیں کر رہا تھا تو یہ لڑکی مجھے پردہ نشین مسلمان لڑکی لگتی تھی۔

”تم نے اپنی بڑی بہن کے گھر چابیوں کا گچھا اپنی ماں سے لے لیا تھا؟“

”ہاں۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”اُس نے وہاں چارہ پاتی پر رکھا اور پرے چلی گئی تھی۔ میں نے گچھا اٹھا لیا کہ گم نہ ہو جاتے۔“ اس کے بولنے کا انداز شریفانہ تھا۔

”تم سے گھر کا کون آدمی چابیاں لے گیا تھا؟“ میں نے ہوا میں تیر چلایا۔

”کوئی بھی نہیں۔“ اُس نے میرا تیر ضائع کر دیا۔

”شاید تمہارا ایک بھائی چابیاں لینے آیا تھا۔“ میں نے ایک اور تیر چلایا۔

”نہیں تو۔“ وہ بولی۔ ”دونوں بھائی کٹائی پر گئے ہوتے تھے۔ شام کو واپس آتے تھے۔“

”تم بہن کے گھر سے کہاں چلی گئی تھیں؟“ یہ بھی ہوا میں چلایا ہوا ایک تیر تھا۔

بعض سوال مشتبہ کارِ عمل اور چہرے کے تاثر کی تبدیلی دیکھنے کے

بائیں مارنے لگتا ہے۔ لہٰذا ان دونوں بھائیوں کے متعلق میں نے کوئی رائے قائم نہ کی۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بھی کسی پر شک کا اظہار نہ کیا۔

محلے داروں کو گراما دیا

میں نے اسی مکان کی ڈلوڑھی میں اس کے سامنے اور دائیں بائیں رہنے والے چند ایک معزز آدمیوں کو بلایا اور انہیں کہا کہ اس گھر میں چوری ہو گئی ہے۔ یہ چوری کسی گھر بھیدی نے کرائی ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے، ہر گھر میں چوری کر سکتا ہے۔ تمہارے گھروں میں کیا محفوظ رہ گیا ہے؟ اس گھر کے تالے لگے رہے اور اندر سے ڈیڑھ ہزار روپیہ نکل گیا۔ کیا یہ رقم جن بھوت لے گئے ہیں؟ چور اسی محلے میں ہے اور تم سب کے سامنے پھر رہا ہے۔ میرے پاس کوئی جادو نہیں جس کے زور پر میں چور کو پہچان لوں گا۔ تم لوگ میری مدد کرو گے تو چور پکڑا جائے گا۔ اس میں تمہارا فائدہ ہے، ورنہ سب کے گھروں سے رقمیں اور زیورات غائب ہوں گے اور میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتوں گا۔

”میں تم سب سے صرف ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اس گھر کے تمام افراد تین روز پہلے اپنی بیٹی کے گھر چلے گئے تھے۔ صبح سے دوپہر تک وہیں رہے۔ اس دوران کوئی آدمی یا عورت

لے پوچھے جاتے ہیں۔ میں نے اس لڑکی کے چہرے پر صاف تبدیلی اور آنکھوں میں بے چینی دیکھی۔ میں ابھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ تبدیلی ایک ملازم کے چہرے کی تبدیلی تھی۔ کسی پر بے بنیاد شک کا اظہار کرو۔ تو اس کے چہرے پر بھی ایسی ہی تبدیلی آیا کرتی ہے۔ اجیت کو رنے پہلے کی طرح جواب فوراً نہ دیا۔

”میں کہیں نہیں گئی۔“ اس نے کہا اور ذرا اکھڑی ہوئی آواز میں کہنے لگی۔ ”نہی، میں تو کہیں نہیں گئی۔ بہن کے گھر رہی تھی۔“

سے بیچ کر میں نے اس کے دونوں بھائیوں کو باری باری بلایا۔ دونوں سے نوکر اور نوکرانی کے متعلق پوچھا۔ دونوں نے کہا کہ وہ ایسی حرکت نہیں کر سکتے، بہت سیدھے ہیں۔ میں نے دونوں سے کہا۔ ”تم کٹاٹی چھوڑ کر گھر کیوں آتے تھے؟“ دونوں کا رد عمل ایک جیسا تھا۔ انہوں نے بڑے پختہ اور دو لڑک طریقے سے کہا کہ وہ گھر نہیں آتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ گھر والے گھر کو تالے لگا کر بہن کے گھر جا رہے ہیں۔ وہ شام کو گھر آئے تھے۔

ان کے متعلق تو مجھے دوسرے ذرائع سے رپورٹ لینی تھی۔ انہیں صرف دیکھنا تھا۔ دیہاتی سکھ کے متعلق بتانا کہ یہ شریف ہے یا بد معاشر بہت مشکل ہوتا ہے۔ جیسا کہ بتا چکا ہوں، ہر سکھ گالیوں کی زبان میں بات کیا کرتا ہے۔ ہر سکھ دیسی شراب پانی کی طرح پیتا ہے۔ کسی بھی دیہاتی سکھ کو بھڑکا دیا اور ہوا دے دو تو وہ پنجابی فلموں کے ہیرو اور ولن کی طرح

تفتیش کرتی تھی اور لوگ تفتیش میں مدد دیتے تھے۔ گواہوں کو پولیس کا تحفظ حاصل ہوتا تھا۔ چوری چکاری کے کیسوں میں لوگ کوئی نہ کوئی سراغ لے ہی آتے تھے۔

میں صوبیدار کے نوکر اور نوکرانی کو ساتھ لے کر بھانے چلا گیا۔ وہاں جا کر نوکر سے صوبیدار کے مزارعوں اور دو چار دوسرے کسانوں اور مزارعوں کے نام پوچھ کر ایک کانسٹیبل سے کہا کہ وہ ان سب کو بھانے لے آئے۔

لڑکی نارمل نہیں تھی

نوکرانی ادھیڑ عمر عورت تھی۔ بہت گھبراتی ہوتی تھی۔ وہ سیکھ تھی اور بیوہ۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ عمریں بارہ چودہ سال ہوں گی۔ ہمارے معاشرے کا، پولیس کا اور ہم سب کا یہ دستور ہے کہ مزارعہ، نوکر اور غریب آدمی کو ہم شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور ان کی قسموں اور ان کی بے گناہی کے آسواؤں پر بھی اعتبار نہیں کرتے۔ یہ محاورہ اپنے اندر حقیقی معنی رکھتا ہے کہ مفلسی سب سے بڑا جرم ہے۔ خوشحال اور حیثیت والے لوگوں کو ہم نیک اور پاک سمجھتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی رویہ میرا تھا۔ میں نے اُسے سیدھے الفاظ میں کہا کہ وہ جس گھر میں ملازم ہے وہاں سے پیسے چوری ہو گئے ہیں۔ اگر یہ اُس کا کام ہے تو صاف بتا دے اور

چھت کی طرف سے یا دروازے کی طرف سے اندر آتی اور اُس لے چوری کی۔ دن کا وقت تھا۔ گلی میں کوئی نہ کوئی موجود ہوگا۔ کسی نہ کسی کو ضرور دیکھا ہوگا۔ تم لوگ اندھے نہیں ہو گئے۔ دل میں جا کر اپنی بیویوں اور اپنے بچوں سے پوچھو کہ اُس روز انہوں نے کسی کو اس گھر کی کنڈی، کھول کر اندر جاتے اور باہر نکلتے دیکھا ہوگا۔ اگر وہ اس گھر کا ہی کوئی فرد تھا تو بھی مجھے بتاؤ۔ سب کو لعن طعن کر کے گرا دیا۔ انہیں ناروغ کر کے میں نے نمبر دار، ذیلدار اور سفید پوش سے کہا کہ وہ کوشش کریں اور میں نے جو بات معلوم کرنے کے لئے سب کو کہا۔ ہے، اس کا سراغ وہ تینوں لگائیں۔ میں نے سکھ صوبیدار سے الگ ہو کر ان تینوں سے کہا کہ اگر اس گھر کا ہی کوئی فرد آکر چلا گیا تھا تو وہ بھی مجھے بتائیں۔ یہ تینوں چونکہ سرکاری آدمی تھے اس لئے انہیں میں نے ان کے خلاف کارروائی کی دھمکی دی اور انعام کا لالچ بھی دیا۔

ان سب کو گرامے اور ہوا دینے سے مجھے امید تھی کہ کہیں سے کوئی سراغ مل جائے گا۔ آج کل حالات اتنے بگڑ گئے ہیں کہ لوگوں کے سامنے واردات ہوتی ہے تو کوئی گواہی دینے کے لئے سامنے نہیں آتا۔ جرائم پیشہ لوگوں کو کسی غیبی طاقت کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔ اب تو یہاں تک بھی ہوتا ہے کہ گواہوں کو سرعام دھمکیاں دی جاتی ہیں اور کسی نہ کسی گواہ پر تاننا حملے کی خبر بھی اخباروں میں چھپ جاتی ہے۔ میں جس وقت کی بات کر رہا ہوں اُس وقت پولیس و یا انتہاری سے جرائم کی

رقم واپس کر دے، میں اُسے بچاؤں گا۔

اُس کی حالت بہت بُری ہو گئی۔ اُس کے مُنہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی وہ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے راستے بہنے لگا۔ اُس نے کہا کہ اُس نے اپنے دو بچوں کی خاطر اس گھر کی بہت خدمت کی ہے اور پوری دیانتداری سے کام کیا ہے تاکہ اُس کے بچوں کو روٹی ملتی رہے۔ اُس نے اپنے خاوند کو یاد کیا اور بہت روتی۔ اُس نے کہا کہ سرکاسیتیں زندہ ہوتا تو آج مجھ پر چوری کا الزام نہ لگتا۔

اگر مٹھانیدار جذبات میں الجھ جاتے تو وہ کسی بھی واردات کی تفتیش نہ کر سکے۔ اگر میں آپ کو وہ ساری باتیں سُناؤں جو اُس نے کہی تھیں تو آپ کے آنسو نکل آئیں۔ میں اُس سے متاثر ہو گیا تھا لیکن میرے سامنے ایک حقیقت تھی۔ میں اُسے حقیقت کی طرف لے آیا اور پوچھا کہ جس روز صوبیدار اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ اپنی بڑی بیٹی کے گھر گیا تھا، اُس روز وہ کہاں رہی تھی۔ اُس نے جواب دیا کہ وہ ساتھ والے گاؤں میں اپنی ایک بہن کے گھر چلی گئی تھی۔ اُسے چونکہ چھٹی کبھی کبھی ملا کرتی ہے اس لئے اپنی بہن سے کم ہی مل سکتی ہے۔ اُس روز اُسے موقع ملا اور وہ بچوں کو لے کر چلی گئی اور شام سے دراپٹلے واپس آتی تھی۔

”تمہیں یہ تو پتہ ہو گا کہ تمہاری ماکن ٹرنکوں کی چابیاں کہاں رکھتی ہے۔“

”نہیں جی!“ اُس نے جواب دیا۔ ”مجھے بالکل علم نہیں۔“

یہ تو میں نے معلوم کر لینا تھا کہ وہ اپنی بہن کے گاؤں گئی تھی یا نہیں اور کیا وہ وہیں رہی تھی یا کچھ دیر کے لئے غائب ہو گئی تھی۔ میں نے اُس سے گھر کے بھیدیلنے کے لئے اُسے یہ یقین دلایا کہ مجھے اُس پر اعتبار کیا ہے۔ میں نے اُس سے اجیت کو ر کے متعلق پوچھا کہ وہ کیسی لڑکی ہے، اس کی عادتیں کیسی ہیں اور اُس کا کہیں میل جول ہے یا نہیں۔ نوکرانی کا یہ ڈر بجا تھا کہ اُس کے مالکوں کو پتہ چل جائے گا کہ اس نے مجھے اُن کی بیٹی کے متعلق کچھ باتیں بتاتی ہیں۔ میں نے اُس کا یہ ڈر دُور کر دیا۔

میری توقع کے خلاف اُس نے اجیت کو ر کی بہت تعریف کی اور بتایا کہ لڑکی کا رجحان مذہب کی طرف زیادہ ہے اور اُس میں لونجوان اور خوبصورت لڑکیوں والی شوخی ہے ہی نہیں۔ بیاہ شادیوں پر لڑکیاں اکٹھی ہوتی اور گاتی بجاتی ہیں لیکن اجیت کو ر شادی والے گھر چلی تو جاتی ہے لیکن گاتی بجاتی نہیں۔ اُس کی آواز سربلی ہے مگر وہ شب کیرن گاتی ہے۔ بچی ہوتی روٹی کے ٹکڑے لے کر معن میں بیٹھ جاتی یا چھت پر چلی جاتی ہے اور ٹکڑے پر مندوں کو کھلاتی رہتی ہے۔ گھر میں کوئی غریب آجاتے تو اُسے اپنے اچھے کپڑے بھی دے دیتی ہے۔ مال نے اُسے دو تین بار بیٹا بھی تھا۔ اُس نے ایک عورت کو اپنے کپڑے ایک اور بھکاری کو بہت سے پیسے دے دیتے تھے۔ اُس نے اپنے بھائیوں اور باپ سے کتنی بار کہا تھا کہ وہ شراب نہ پیا کریں لیکن سکھ اپنی بیوی کو چھوڑ سکتا ہے شراب نہیں چھوڑ سکتا۔ نوکرانی سے میں نے کہا کہ وہ آخر جوان لڑکی ہے، کسی کو چاہتی ہوگی۔

”گاؤں کی عورتیں آتی رہتی ہیں“ اُس نے جواب دیا۔ ”دو تین کے ساتھ سردارنی کے تعلقات بہت گہرے ہیں لیکن میں نے کبھی کسی عورت کو اُس گھر سے میں سردارنی کے ساتھ جاتے نہیں دیکھا جس میں ٹرنک رکھے ہیں“

یہ عورت مجھے اپنی رہائی کے لئے غرض کرنا چاہتی تھی اس لئے میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کوشش کر رہی تھی کہ میں جو پوچھوں اُس کا جواب صحیح اور مکمل دے۔ اس سے میں نے بہت کچھ پوچھا۔ صوبیدار اور اُس کی بیوی کے آپس کے تعلقات کے متعلق بھی پوچھا۔ وہ بتاتی رہی۔ میں نے اس عورت کو بہت دیر اپنے ساتھ رکھا اور مجھے یقین آ گیا کہ اس کا اگر کوئی جرم ہے تو وہ صرف مفلسی اور بیوگی ہے اور یہ کہ وہ دو بچوں کی مال ہے۔ اُسے میں نے چھٹی دسے دی اور ایک کانٹیل سے کہا کہ وہ اس عورت کی بہن کے گاؤں جاتے اور نمبر دار کو ساتھ لے کر معلوم کرے کہ یہ فلاں دن اپنی بہن کے ہاں گئی تھی۔ کیا واقعی گئی تھی؟ کتنی دیر وہاں رہی تھی؟ کیا اس دوران کہیں چلی گئی تھی؟

ایک خوبصورت اور چالاک عورت

چار پانچ مزارعے آگئے۔ صوبیدار کا نوکر بھی تھا۔ میں نے پہلے اُسے بلایا اور اُسے بھی نوکرانی کی طرح کہا کہ اگر چوری اُس نے کی ہے تو رقم

نوکرانی نے بتایا کہ وہ شاید کسی کو چاہتی ہوگی مگر اسے کوئی نہیں چاہتا۔ اس کا نورشتہ مانگنے بھی کوئی نہیں آتا۔ سب کہتے ہیں کہ یہ تو واہگور کی گاتے ہے۔ اُس کی شکل و صورت پر مرنے والے تو بہت ہیں، اس کی عادتوں سے سب گھبراتے ہیں۔ بعض تو یہ کہتے ہیں کہ اس کے دماغ میں کوئی نقص ہے۔ نوکرانی نے اس کی عادتوں وغیرہ کی جو تفصیل بتائی، اس سے میں نے بھی یہی راستے قائم کی انارمل لڑکی ہے اور یہ شاید مذہبی جنون کی وجہ سے ہے۔ ایسی لڑکی کو کوئی گرنہی یا گور ووارے کا کوئی ”بھائی“ قبول کر سکتا تھا۔ بہر حال اجیت کو رکے متعلق مجھے جو شک تھا، وہ رفع ہو گیا اور نوکرانی نے بھی اپنے خلاف شک رفع کر دیا۔ اجیت کو رکے بھائیوں کے چال چلن کے خلاف اُس نے کوئی بات نہ کہی۔ میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ دونوں بھائی اپنے ماں باپ کے فرمانبردار ہیں اور اُن کا آپس میں یا اپنے ماں باپ کے ساتھ کبھی لڑائی جھگڑا نہیں ہوا۔

ساتھ والے گھروں کے افراد کے متعلق اُس سے تفصیل پوچھی۔ مجھے شک تھا کہ ان میں کوئی مجرمانہ عادات کا نوجوان ہو گا یا کوئی مشکوک چال چلن کی عورت رہتی ہوگی۔ اُس نے بتایا کہ وہ سب خوشحال گھرانے ہیں اور ان میں سے کسی عورت کا صوبیدار کے گھر آنا جانا اتنا زیادہ نہیں کہ اُسے یہ بھی معلوم ہو کہ فلاں ٹرنک میں رقم رکھی ہوتی ہے۔

”کوئی اور عورت بتا سکتی ہو جس کے ساتھ تمہاری مالکن کے تعلقات اتنے گہرے ہوں کہ اُسے یہ بھی معلوم ہو کہ رقم اور زیورات کہاں رکھے ہیں؟“

والیں کر دے، اُسے سچا لوں گا۔ اُس کا رد عمل بھی نوکرانی جیسا تھا۔ مجھے اُس کے چہرے پر اور اُس کے انداز میں جرم نظر نہیں آ رہا تھا لیکن بعض نہایت شریف آدمی بھی اپنے۔ اُسے رقم پڑی دیکھ کر جیب میں ڈال لیتے ہیں۔ اس نوکر نے بھی روکر اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اُسے بہت ڈرایا دھمکایا اور اُسے خبردار کیا کہ اُس پر جو تشدد کیا جاتے گا، اس کے تصور سے ہی وہ بے ہوش ہو جائے گا مگر وہ ہاتھ جوڑے ہوئے منت سماجت کرتا اور ہچکیاں لے لے کے روتا رہا۔

میں نے اُس سے دوسری باتیں معلوم کرنے کے لئے اُسے سنبھالا دینا چاہا، تسلی دلا دیا مگر وہ اور زیادہ رونے لگا۔ میں تھکا ہوا تھا اور ابھی تک کوئی کھرا کھوج میرے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے اُس کے مُنہ پر اتنی زور سے پھینٹ مارا کہ وہ دیوار کے ساتھ جا لگا۔ اس کے ساتھ میں نے گرج کر کہا۔ ”چپ ہو جا“۔ یوں لگا جیسے کھڑے کھڑے اُس کی جان نکل گئی ہو۔ ایک ہاتھ اپنے گال پر رکھ کر وہ بُت بن گیا۔

ایک سکھ کانٹیل کو بلا کر اُسے کہا کہ اسے پانی پلاؤ۔ وہ پانی پی چکا تو میں نے اُسے کہا کہ اگر وہ بے گناہ ہے تو میں جو پوچھتا ہوں، وہ سچ سچ بتا دے، ورنہ ہڈیاں توڑ دوں گا۔ ایک ہی پھینٹ اُسے ٹھکانے لے آیا تھا۔ کچھ اور جھک جھک کر میں نے اُس کا ڈر دُر کیا۔ بڑی لمبی پوچھ گچھ سے اُس نے جو کچھ بتایا وہ نوکرانی کے بیان کی تائید تھا۔ اجیت کور کے متعلق اُس نے وہی بتایا جو نوکرانی نے بتایا تھا۔

”جس روز یہ لوگ اپنی بڑی بیٹی کے گھر چلے گئے تھے، اُس روز تم نے دن کہاں گزارا تھا؟“

”کٹائی میں“۔ اُس نے جواب دیا۔ ”کٹائی میں تو ہر کسی کی مزدورت ہوتی ہے۔ ان دنوں مجھے کھیتوں میں بلا لیتے ہیں۔“

”سوچو اور اچھی طرح یاد کر کے مجھے بتاؤ کہ اُس روز دونوں بھائیوں میں سے کوئی ایک کچھ دیر کے لئے گھر آیا تھا؟“

اُس نے سوچ سوچ کر بتایا کہ وہ کٹائی میں لگا رہا تھا۔ اُس نے دیکھا نہیں۔ دونوں بھائی بھی کٹائی کر رہے تھے۔

”اب مجھے بالکل صحیح بتاؤ کہ دونوں بھائیوں کا چال چلن اور عادتیں کیسی ہیں؟“

وہ پھر گھبرا گیا اور ہاتھ جوڑ کر اُس نے منت کے لہجے میں کہا۔ ”میں ان کا نوکر ہوں مہاراج جی! اس نہیں پتہ چل گیا تو مجھے جان سے مار ڈالیں گے!“

میں نے اُسے حوصلہ دیا اور یقین دلایا کہ اُس کے مالکوں کو پتہ نہیں چلے گا کہ اُس نے کچھ بتایا ہے۔ اُس نے جو انکشاف کیا وہ یہ تھا کہ دونوں بھائیوں میں اور نوکر کوئی بُری عادت نہیں، البتہ بڑے بھائی کا دوستانہ ایک ہندو عورت کے ساتھ ہے۔ وہ بہت خوبصورت عورت ہے اور بڑی چالاک ہے۔ نوکر نے بتایا کہ وہ ان کے پیغام ایک دوسرے تک پہنچاتا ہے۔ اُس نے یہ راز فاش کیا کہ یہ عورت پیسے مانگتی رہتی ہے۔

”عموماً کتنی رقم مانگتی ہے؟“

”کبھی پندرہ روپے کبھی بیس روپے“۔ اُس نے جواب دیا۔

”اور بڑا بھاتی اُسے روپے دے دیتا ہے؟“

”سہرا دے دیتا ہے!“

”پچھلے دنوں اس عورت نے زیادہ رقم نہیں مانگی تھی؟“

”مانگی تو نہیں تھی لیکن مجھے ایک شک ہے“۔ اُس نے جواب دیا

— ”یہ عورت شادی شدہ ہے۔ اُس نے اپنی چھوٹی مہن کو اپنے پاس

رکھا ہوا ہے کیونکہ ان کے ماں باپ مر چکے ہیں۔ یہ عورت بہن کی شادی

کی نگر میں رہتی ہے۔ وہ سنت سنگھ (صوبیدار کا بڑا بیٹا) سے ضرور مدد

مانگے گی یا مانگ چکی ہوگی۔“

نوکر میری حوصلہ افزائی سے اب عقل کی باتیں کرنے پر آگیا تھا۔

میں نے اُس سے پوچھا کہ اُس نے کس طرح محسوس کیا ہے کہ اس عورت

نے سنت سنگھ سے رقم مانگی ہوگی یا مانگے گی؟ اُس نے بتایا کہ وہ

تین سال سے اُن کے درمیان آبا ہوا ہے۔ اُس نے عورت کی کچھ

باتیں سنائیں جن سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سنت سنگھ کی کھال اُتار رہی ہے۔

نوکر نے یاد کر کے کہا — ”پچھلے سال کٹائی کے بعد اس عورت

نے مجھے کہا تھا کہ سنت سے کہنا کہ سنار نے انگوٹھی تیار کر دی ہے۔۔۔

میں نے سنت سنگھ سے کہہ دیا۔ اس نے کچھ بھی نہ کہا۔ دو تین روز بعد سنت سنگھ

نے مجھے کپڑے میں بندھی ہوئی ایک چیز دے کر کہا کہ اُسے دے دینا۔

میں نے لے جاتے ہوئے کھول کر دیکھا یہ سونے کی انگوٹھی تھی۔“

”کیا یہ عورت صوبیدار کے گھر آتی رہتی ہے؟“

”آتی ہے“۔ نوکر نے جواب دیا — ”لیکن سردار نی اسے پسند

نہیں کرتی۔ ادھر ادھر کی باتیں کر کے ٹال دیتی ہے۔“

”گاؤں والوں کو ان کی دوستی کا علم ہے؟“

”کئی لوگ جانتے ہیں۔“

”سنت سنگھ کے باپ کو بھی معلوم ہے؟“

”شاید اُسے معلوم نہیں“۔ نوکر نے جواب دیا — ”اگر صوبیدار

کو پتہ چل جائے تو بیٹے کی ہڈیاں توڑ دے۔“

اس سلسلے میں میں نے نوکر سے جو معلومات حاصل کر فی تھیں

کر لیں اور اُسے سختی سے کہہ دیا کہ وہ کسی کو نہ بتائے کہ میں اُس سے

کیا پوچھتا رہا ہوں اور اُس نے مجھے کیا بتایا ہے۔

مردوں کو انگلیوں پر سچا لیتی ہے

مزارعوں کو اکیلے اکیلے بلایا۔ ان سے میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ

صوبیدار اپنے کہنے کے ساتھ اپنی بڑی بیٹی کے گھر چلا گیا تھا تو اس

دوران دونوں بھائیوں میں سے کوئی کٹائی سے غیر حاضر ہوا تھا؟

اب نوکر مجھ پر بڑا اطمینان کا اظہار کر گیا تھا، اس لئے میرے لئے یہ

معلوم کرنا کہ بڑا بھجائی سنت سنگھ کٹائی سے غیر حاضر ہوا تھا یا نہیں، زیادہ ضروری ہو گیا تھا۔ اور اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ چور اسی گھر میں ہے اور چوری اسی روز ہوتی ہے جب باروز گھر والے تالے لگا کر گئے تھے۔

یہ غریب لوگ تھاندار اور اُس کے بھانے سے بھی ڈرتے تھے اور اپنے مالکوں سے بھی کھل کر بات کرتے گھبراتے تھے۔ ان میں سے صرف ایک نے بتایا کہ سنت سنگھ کٹائی چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا۔ اُس کے انداز سے کے مطابق وہ ڈیڑھ گھنٹہ غائب رہا تھا۔

وہ دن اسی میں گزر گیا۔ رات کو نمبر دار میرے گھر آیا۔ وہ صرف یہ بتانے آیا تھا کہ وہ سراسر زانی میں مصروف ہے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ آجائے۔ میں نے اُس سے سنت سنگھ اور ہندو عورت کے متعلق پوچھا۔ اُس نے نوکر کے بیان کی تصدیق کی۔ اس عورت کے متعلق اُس نے بتایا کہ اُس کا خاوند بھو اور شریف آدمی ہے۔ گاؤں میں اُس کی چھوٹی سی دکان ہے۔ اُس نے اپنی بیوی پر یہ احسان کر رکھا ہے کہ اس کی چھوٹی بہن کو اپنے گھر رکھ لیا ہے۔ بہن شریف لڑکی ہے لیکن بڑی بہن کا چلن اچھا نہیں۔ وہ اتنی بڑی بھی نہیں کہ ہر کسی کے ساتھ دوستی لگاتی پھرے مردوں کو انگلیوں پر سچا لیتی ہے۔ سنت سنگھ کے ساتھ اُس کی مستقل دوستی ہے۔

نمبر دار ہندو تھا اس لئے میں اُسے سنت سنگھ کے خلاف استعمال کر سکتا تھا۔ یہ میرا تجربہ تھا کہ سنگھ نمبر دار سکھوں کی بہت مدد کیا کرتے تھے۔

کوئی سکھ جرم کی بیعت نہ کر سکھ نمبر دار اُسے سچانے کی کوشش کرتے تھے۔ میں نے اس ہندو نمبر دار سے کہا کہ کوئی شریف ہے یا بد معاش، مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ میری دلچسپی اس کیس کے ساتھ ہے جو میں رجسٹر کر بیٹھا ہوں۔ میری توجہ اب سنت سنگھ پر آگئی ہے۔ اُس کے پاس مالوں کی دوسری چابیاں تھیں جو اُس نے اپنے پاس رکھ لی تھیں۔ اس کے ماں باپ اور بہن گھر کو تالے لگا کر گئے اور سنت سنگھ نے آکر تالے کھولے۔ ٹرنک کے تالے کی دوسری چابی نہیں تھی۔ چنانچہ اُس نے پیچھے سے قبضہ اکھاڑ کر ڈھکنا اٹھالیا اور رقم لے گیا۔ اُس نے یہ رقم اس ہندو عورت کو دی ہے۔ اُس نے اپنی بہن کی شادی کے لئے مانگی ہوگی۔

نمبر دار نے وثوق سے کہا کہ صوبیدار کے دونوں بیٹوں میں اور کوئی عیب نہیں، البتہ سنت سنگھ اس عورت کے چکر میں آیا ہوا ہے۔ میں نے نمبر دار کو کچھ معلومات لانے کے لئے کہا اور اُسے دو مہینے ڈھنگ بھی بتاتے۔ میرے ذہن سے اجیت کو رنل چلی تھی۔ اب شک کا مرکز اُس کا بھجائی سنت سنگھ تھا۔ پھر بھی میں نے نمبر دار سے اجیت کو رنل کے متعلق پوچھا۔

”اس لڑکی کی وجہ سے اس کا بڑا بھجائی اس ہندو عورت کے چکر میں آ گیا ہے۔“ نمبر دار نے کہا۔ میں نے حیران ساہو کے نمبر دار کی طرف دیکھا کہ یہ کوئی انکشاف ہو گا۔ اُس نے کہا — ”صوبیدار پہلے اجیت کو رنل کی شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کے بعد دونوں بیٹوں کی شادی اکٹھی کر دے گا۔“

بھاتی بھی یہی کہتے پھرتے ہیں کہ وہ بہن کو رخصت کر کے شادی کریں گے مگر بہن کا رشتہ لینے کو تو نہیں آتا۔ یہ لڑکی ظاہری طور پر تو مذہب کی سخت پابند ہے، لیکن اس میں کوئی دماغی نقص ہے۔ شاید وہ کوئی رشتہ قبول بھی نہیں کر رہی۔ مجھے ایلے نظر آ رہا ہے کہ یہ لڑکی گھر سے بھاگ جانے کی اور سیدی امرتسر دربار پہنچنے کی۔ اسے بالکل احساس نہیں کہ وہ خوبصورت اور نوجوان لڑکی ہے اور اسے اگر کسی ریاست کا مہاراجہ دیکھ لے تو بیروں کے عرص بیاباہ کر لے جائے۔ نہ اُس کی شادی ہوتی ہے نہ ماں باپ اپنے بیٹوں کا کوئی بند و بست کرتے ہیں۔ بڑا بیٹا سنت سنگھ ایک نو سر بار عورت کے جال میں چسپن گیا ہے۔

میں نے بھی اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ باتیں بھی کی تھیں۔ مجھے ذرا سا بھی شک نہیں ہوا تھا کہ یہ لڑکی ذہنی مریض ہے۔ میں نے صرف یہ دیکھا تھا کہ لڑکی مذہب کے رنگ میں رنگی ہوتی ہے اور میں نے اپنے آپ سے کہا تھا کہ اسے سکھوں کے گھر میں پیدا سنہیں ہونا چاہیے تھا۔ بہر حال اب اُس سے میری توجہ ہٹ گئی تھی۔

پسیلا رومال، لال ست سری اکال

دوسرے دن میں کسی اور کیس میں مصروف ہو گیا۔ اس گاؤں کے ایک مسلمان نوجوان نے ایک ہندو پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ اُسے گرفتار

کر کے ہم نے جوڈیشل حوالات میں بھیج دیا تھا۔ ہندو کا بیان تھا کہ اُس نے اُسے لوٹنے کی کوشش کی تھی۔ گواہیاں ایسی لاتی گئی تھیں کہ کیس بہت مضبوط ہو گیا تھا۔ میں خود چند ایک کیسوں میں اُلجھا ہوا تھا اس لئے میں نے اس مسلمان کا کیس اے۔ ایس۔ آئی رکھیں سنگھ کے سپرد کر دیا تھا۔ رکھیں سنگھ ہندو راجپوت تھا۔ کیس آسان تھا۔ تفتیش میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔ ہندو خود ہی شہادت فراہم کر رہا تھا۔ مسلمان یعنی ملزم کے وکیل نے اُس کی ضمانت کے لئے درخواست دی تھی جو مجسٹریٹ نے مسترد کر دی تھی۔ جرم کی نوعیت ایسی تھی کہ میں خود بھی اس کوشش میں تھا کہ ملزم کی ابھی ضمانت نہ ہو۔ رکھیں سنگھ سے میں نے کہہ رکھا تھا کہ ضمانت نہ ہونے دینا، مگر مجھے پتہ چلا کہ ملزم ضمانت پر رہا ہو گیا ہے۔

رکھیں سنگھ کو رٹ سے آیا تو اُس نے بتایا کہ ملزم کا پہلا وکیل بہت کمزور اور نالائق تھا۔ اب اُس نے بڑا اچھا وکیل کر لیا ہے۔ ملزم عزیز آدمی تھا۔ اس نے جرم بڑا سنگین کیا تھا۔ عزت کی وجہ سے وہ کوئی قابل وکیل نہیں کر سکا تھا۔ اُس نے جرم بھی عزت کی وجہ سے ہی کیا تھا لیکن اُس کی دلیری کا یہ عالم تھا کہ بھانے میں اُسے لایا گیا تو ہم سب کو لگتا تھا۔ جس ہندو کو اُس نے زخمی کیا تھا، اُس پر لڑٹ لڑٹ پڑتا اور غرے لگاتا تھا۔ ”سچے کی مدد خدا کرے گا۔“

دس بارہ ہندو بھانے میں آگئے تھے۔ ان میں عینی شاہد بھی تھے۔ ملزم کی زبان بند نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے کہیں اور جانا تھا۔ میں کیس

رگھیر سنگھ کے حوالے کر کے چلا گیا۔ اس کے بعد رگھیر سنگھ اس کیس کی جو کارگزاری اور دلاوری میرے آگے رکھتا رہا، میں اس پر دستخط کرتا رہا۔ اُس روز جب اُسے۔ ایس۔ آتی رگھیر سنگھ نے عدالت سے آکر بتایا کہ ملازم منہانت پر رہا ہو گیا ہے تو مجھے غصہ آگیا۔ منہانت سیشن کورٹ سے ہوتی تھی۔ رگھیر سنگھ بھی کورٹ میں گیا تھا۔ میں نے اُسے کہا کہ اُس نے سرکاری وکیل کو بتایا نہیں ہوگا کہ ملازم کی منہانت نہیں ہوئی چاہیتے۔ وہ منہانت نہ کر سکتا تھا۔ رگھیر سنگھ بار بار کہتا تھا کہ ملازم نے ایک مہنگا اور قابل وکیل کر لیا ہے۔

ہم دونوں برآمدے میں کہ سیوں پر بیٹھے تھے۔ رگھیر سنگھ نے جیب سے رومال نکالا اور چہرے سے پسینہ صاف کیا۔ میں نے اتفاق سے دیکھا اور میں چونک پڑا۔ رومال ریشمی تھا اور اس کا رنگ پیلا تھا۔ اس کے درمیان مجھے لال لکڑھاتی نظر آتی۔ میں نے مذاق کے انداز سے کہا۔ ”رگھیر بار! یہ ریشمی رومال کسی معشوق نے دیا ہے؟“ میں نے اُس کے ہاتھ سے ہنستے ہنستے رومال لے لیا۔ رومال کے درمیان لال دھاگے سے گورکھی میں ”ست سری اکال“ کا ٹھٹھا ہوا تھا۔ میں آپ کو سننا چکا ہوں کہ صوبیدار کی بیوی نے میرے پوچھنے پر مجھے بتایا تھا کہ رقم جو چوری ہوتی ہے وہ پیلے رنگ کے ریشمی رومال میں بندھی ہوتی ہے۔ اُس نے مجھے ایک اور نشانی یہ بتائی تھی کہ اس کے درمیان لال دھاگے سے گورکھی میں ”ست سری اکال“ کا ٹھٹھا ہوا ہے۔ مجھے معلوم

نہیں تھا کہ وہ یہی رومال تھا۔ میں نے پہلے تو یہ دیکھا ہی نہیں تھا۔ مجھے یقین سا ہو گیا کہ یہ وہی رومال ہے۔ ایسے رومال بازار میں تو نہیں سکتے تھے کہ بہت سے لوگوں کے پاس ہوتے۔

اس کی شناخت صوبیدار کی بیوی اور بیٹی کر سکتی تھی۔ میں نے شناخت کا انتظار نہ کیا۔ رومال ہاتھ میں لے لے میں کانٹیلبلوں کے کمرے میں چلا گیا اور ایک کانٹیلبل سے کہا کہ صوبیدار اُس کی بیوی اور اُس کی بیٹی کو ساتھ لے آؤ۔

راز اُس رومال کا

”رگھیر! میں نے برآمدے میں آکر رگھیر سنگھ کے سامنے بیٹھے ہوتے پوچھا۔ ”یہ رومال تمہارے پاس کس طرح آیا ہے؟“ اُس نے رومال میرے ہاتھ سے لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور نگفٹہ لہجے میں بولا۔ ”ایک سکھنی کی نشانی ہے ملک صاحب!“ ”رگھیر سنگھ!“ میں نے کہا۔ ”میں مذاق نہیں کر رہا۔ اس سے پہلے کہ یہ رومال کوئی اور اگر شناخت کرے، مجھے بتا دو کہ یہ تمہارے پاس کس طرح آیا ہے!“ ”ملک صاحب؟“ اُس نے حیران سا ہونے کے پوچھا۔ ”کیا ہو گیا ہے آپ کو؟“

”میں جو پوچھتا ہوں مجھے وہ بتاؤ۔“ میں نے ذرا دبے سے کہا۔ ”مجھے جانتے ہو میں کیسا آدمی ہوں۔ میں تمہیں ابھی لاتن حاضر کر دوں گا۔ اس کے بعد سیدھے جیل جاؤ گے۔ مجھ سے کسی رعایت یا مدد کی توقع نہ رکھنا۔“

”اپنے ایک دوست کی حبیب سے نکال لایا ہوں۔“ اس نے کہا۔

”اس کا نام؟ پورا پتہ؟“ میں نے کہا۔ ”ابھی اُسے تھانے میں بلاؤ۔“

”ملک صاحب!“ اس نے کہا۔ ”کچھ سمجھاؤ تو سہی۔ میں بتا دوں گا رومال کہاں سے آیا ہے۔ یہ تو بتاؤ کہ یہ کیسا رومال ہے؟“

”جانتے ہو میں کل سے ایک چوری کی تفتیش کر رہا ہوں؟“

”ہاں جانتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”آپ ارجن پور کی بات کر رہے ہیں نا! ایک پشتر سبکھ صوبیدار کے گھر چوری ہوتی ہے۔“

”ہاں!“ میں نے کہا۔ ”رقم اس رومال میں بندھی ہوتی ٹرنک میں رکھی تھی۔“

”آپ نے یہ رومال پہلے دیکھا تھا؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں نے بتائی ہوتی نشانیاں سے پہچانا ہے۔ اسے شناخت کرنے والے آرہے ہیں۔ تم نے کہا ہے کہ یہ ایک سکھ کی نشانی ہے؟ اجیت کور کی بات کر رہے ہو؟“

”اجیت کور؟“ اس نے ہنس کر پوچھا۔ ”میں کسی اجیت کور کو نہیں جانتا۔ وہ تو میں نے مذاق کیا تھا۔“ اس نے ذرا رک کر اور لمبا سانس لے کر کہا۔ ”میں آپ کو زیادہ پکڑ نہیں دوں گا۔ آپ میرے صرف افسر ہی نہیں، آپ خاندانی آدمی ہیں۔ میرے دل میں آپ کی بہت عزت ہے۔ میں نے آپ جیسا۔۔۔“

میں نے غصے میں ایک بڑا ہی گندہ لفظ استعمال کر کے کہا۔ ”مجھے بنانے کی کوشش نہ کرو گھیرا تم جانتے ہو مجھے خوشامد سے نفرت ہے۔ سیدھی بات کرو۔ میری عزت کرنا چاہتے ہو تو بعد میں کر لینا۔ فوراً بتا دو کہ یہ رومال تمہارے پاس کس طرح آیا۔“

میں اس پر سواری تو ہو گیا تھا لیکن یہ سوچ کر مجھے اپنے اندر یہ ڈر محسوس ہوا کہ صوبیدار کی بیوی اور بیٹی نے کہہ دیا کہ یہ وہ رومال نہیں جس میں رقم بندھی ہوئی تھی تو اپنے اسے۔ ایس۔ آئی کے سامنے میری کیا عزت رہے گی۔

”بتانے سے پہلے میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر عرض کر دوں گا کہ آپ کو میرا ایک گناہ بخشنا پڑے گا۔“ اس نے کہا۔

”پہلے بات کرو۔“

”میں نے ملزم کو ضمانت پر رہا ہونے میں مدد دی ہے۔“ اس نے مسلمان ملزم کے متعلق بتایا جسے میں چاہتا تھا کہ ابھی ضمانت پر رہا نہ ہو۔ اس نے کہا۔ ”میں نے پی۔ پی۔ پی (پبلک پراسیکیوٹر) سے کہہ دیا تھا کہ اس

کی منہانت کی درخواست کی مخالفت نہ کرنا۔ میں نے ملزم کے بھائی سے پانچ سو روپیہ لیا ہے۔ اُس نے یہ رقم اس رومال میں پلیٹ رکھی تھی۔ مجھے رومال اچھا لگا تو میں نے اُس سے رومال بھی لے لیا۔ ملزم کا بھائی مجھے بہت دنوں سے کہہ رہا تھا کہ میں اُس کی مدد کروں۔ میں نے اُس سے پانچ سو روپے مانگے تھے۔ یہ رقم اُس نے مجھے آج سیشن کورٹ کے باہر دی ہے۔۔۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ اس سے پہلے وہ اپنے بھائی کے لئے اتنا اچھا وکیل کیوں نہیں کر سکا تھا۔ اُس کے پاس پیسے نہیں تھے۔ اب تین چار دنوں سے اسی غریب آدمی نے مجھے صاف کہنا شروع کر دیا تھا کہ میں اُس کے بھائی کو منہانت پر رہا کرانے کا کیا لوں گا۔ میں نے اُسے پانچ سو روپیہ اس لئے کہا تھا کہ وہ اتنی رقم نہیں لاسکے گا اور میرے پیچھے پھر ناچھوڑ دے گا، لیکن وہ رقم لے آیا اور اُس نے مہنگا ادرا اچھا وکیل بھی کر لیا۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُس نے کہیں ہاتھ مارا ہے اور اُس کا ہاتھ صوبیدار کے گھر پڑا ہے۔ میں گواہ ہوں۔ آپ اُسے بلا لیں۔“

راز کی ایک اور بات

یہ تو بعد کا مسئلہ تھا کہ رشوت خوری کے الزام میں مجھے اے۔ ایس۔ آئی۔ آرگبیر سنگھ کے ساتھ کیا سلوک کرنا تھا، مجھے چوری کی واردات کا جو ملزم

رہا تھا، اُس کی طرف فوری توجہ دینی تھی۔ میں نے ہمیشہ خدا سے مدد مانگی ہے اور خدا نے میری مدد کی ہے۔ میں صوبیدار، اُس کی بیوی اور اُس کی بیٹی کا انتظار کر رہا تھا۔ دو اڑھائی میل دُور سے آتے کچھ وقت درکار تھا۔ مجھے اُس کا دل کا ذیلدار آنا نظر آیا۔ اُس کے ساتھ ایک آدمی تھا۔ وہ ضرور کوئی خبر لایا تھا۔ میں اُسے آنا دیکھ کر برآمدے سے اُٹھا اور اپنے دفتر میں چلا گیا۔ ذیلدار اندر آگیا۔ میں اُسی کے لئے اندر گیا تھا۔ ”ایک خبر لایا ہوں۔“ اُس نے کہا۔ ”آپ لے کہا تھا کہ جس وقت صوبیدار، اُس کی بیوی اور بیٹی اپنی بڑی بیٹی کے گھر گئے ہونے لگے، اُس وقت کوئی آدمی یا کوئی عورت ان کے گھر میں آتی اور اُس لے چوری کی۔ میں کل سے سراغ لگا رہا ہوں۔ آج صبح اس آدمی نے جرمیر سے ساتھ آیا ہے، بتایا ہے کہ صوبیدار کی بیٹی اجیت کو کو اُس نے اپنے مکان کے باہر والے دروازے کی زنجیر کھولتے اور اندر جلتے دیکھا تھا۔ گھر کے اپنے کسی فرد کا اپنے گھر میں داخل ہونا کوئی جرم یا عجبوہ نہیں تھا۔ کسی اور نے بھی اجیت کو کو اپنے گھر میں جاتے دیکھا ہو گا لیکن یہ اُس کا اپنا گھر تھا اس لئے کسی نے اس کا ذکر نہیں کیا۔ آپ کی ہدایت کے مطابق میں معلوم کرتا رہا۔ آخر اس آدمی نے مجھے اجیت کو کو کے متعلق بتایا۔“

میں نے اس آدمی کو اندر بلا کر پوچھا تو اُس نے کہا کہ اُس نے اجیت کو کو کو زنجیر کھول کر اندر جاتے دیکھا تھا۔ میرے پوچھنے پر اُس نے

کہا کہ وہ آگے نکل گیا تھا اس لئے اُس نے لڑکی کو باہر آنے نہیں دیکھا۔
میری دلچسپی سنت سنگھ کے ساتھ تھی۔ میں یہ سننا چاہتا تھا کہ سنت سنگھ
اپنے گھر والوں کی غیبت حاضری میں اپنے گھر میں داخل ہوا تھا۔ بہر حال اب
رگبیر سنگھ اور پیلے رومال نے پیراکام کچھ آسان کر دیا تھا۔ میں نے اپنے
اعتماد کے لئے ایک کانٹیل کو گاؤں سے اُس آدمی کو ساتھ لائے کو بھیج
دیا جس سے رگبیر سنگھ نے رشوت لی تھی۔ ذیلدار اور اُس کے ساتھ کے
آدمی کو میں نے باہر بیٹھنے کو کہا۔ وہ باہر نکلے ہی تھے کہ رگبیر سنگھ اندر آ
گیا۔ وہ میرے کردار اور میری کارروائیوں سے واقف تھا۔ پیلے رومال نے
اُسے پچھندے میں پھانس لیا تھا۔ میں اُسے رشوت خوری معاف نہیں
کرنا چاہتا تھا۔ رشوت تو چلتی ہی تھی لیکن اُس نے میرے کہنے کے باوجود
ملزم کو ضمانت پر رہا ہونے میں مدد دی تھی۔

”مک صاحب!“ رگبیر سنگھ نے مسکرا کر منت کی۔ ”میری غلطی
تو آپ معاف کر دیں گے نا!“

”پہلے مجھے اس تفتیش سے فارغ ہو لینے دو۔“ میں نے ایسے لہجے
میں کہا جس میں بے زنجی اور کچھ حقارت بھی تھی۔ میں نے کہا۔ ”اگر میرا
سٹاف مجھے اس طرح دھوکے دینے لگے جس طرح تم نے دیا ہے تو میں استغاثی
دے کر گھر چلا جاتا ہوں۔ جاؤ، باہر بیٹھو۔“

وہ بہت ہی ڈر گیا تھا۔ میرے سامنے سے اٹھ ہی نہیں رہا تھا۔
میں نے دھتکارا تو بھی بیٹھا رہا۔

”آپ مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کو راز کی ایک اور بات بتا دیتا
ہوں۔“ اُس نے کہا۔ ”آپ جس ملزم کو اتنا خطرناک سمجھتے ہیں کہ اُسے
ضمانت پر رہا نہیں ہونے دے رہے تھے، وہ اتنا خطرناک نہیں اور نہ ہی یہ
۲۵ کا کیس ہے۔ بشیرے (مسلمان ملزم) کی اس ہندو کے ساتھ لڑا جاتی ہو
گئی تھی۔ یہ لڑائی کسی لڑکی پر ہوتی تھی۔ ہندو جو زخمی ہوا تھا، وہ بشیرے کو
مارنا پیٹنا چاہتا تھا مگر بشیرا اُس سے طاقتور تھا۔ اُس نے ہندو کو پیٹ ڈالا۔
گاؤں کے چار پانچ ہندوؤں نے بشیرے کے خلاف یہ پرچہ کر دیا کہ اس
نے اس ہندو پر قاتلانہ حملہ کیا ہے اور اس کی جیب سے رقم نکالنے کی
کوشش کی ہے۔ بشیرے نے بتائے ہیں اگر ہم سب کو لٹکارا اور گالیاں
جو دی جھٹیں، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ غنڈہ اور دلیر ہے بلکہ اصل وجہ
یہ ہے کہ وہ سچا ہے۔ ہندو گواہوں نے اور میں نے اُسے اصل بات
کہنے کی مہلت ہی نہ دی۔ آپ اُس کے روٹیے سے اُس کے خلاف
بہو گئے۔ مجھے ابھی تک معلوم نہیں کہ یہ لڑکی کا کیا چکر تھا اور لڑکی کون تھی؟“
”یہ تو تمہارا دوسرا جرم ہے جو تم مجھے سنا رہے ہو۔“ میں نے کہا۔
”میں نے مصروفیت کی وجہ سے یہ کیس تمہارے حوالے کر دیا تھا۔“
”تو کھو مک صاحب!“ اُس نے کہا۔ ”میں آپ کو راز کی کیسی
کیسی باتیں بتا رہا ہوں اور آپ کا غصہ ٹھنڈا ہی نہیں ہو رہا۔“
میرا غصہ واقعی ٹھنڈا نہیں ہو رہا تھا۔ ہندو تو اس انتظار میں رہتے تھے
کہ کوئی مسلمان ماتحت ذرا سی غلطی کرے تو اسے بہت بڑی غلطی بنا کر اُسے سزا

میں کچھ بندھا رہا ہے۔ اسے جب تک ترک کر کے استری نہ کریں، سلوٹیں
عائب نہیں ہوتیں۔

میں اب تفتیش کے اُس مقام پر آ گیا تھا جہاں ذرا سی بھول چوک
تفتیش کو چوہٹ کر سکتی تھی۔ مجھے اب یہ سوچنا تھا کہ کسے پہلے پوچھ گچھ کی جاتی
میں ڈالوں۔ میرے سامنے ایک سوال یہ تھا کہ اجیت کو اپنے ماں باپ کی
غیر حاضری میں اپنے گھر آتی تھی تو کیا وہ یہ رقم چوری کرنے آتی تھی؟
نہیں۔ وہ مذہب پرست لڑکی تھی۔ اس قدر مذہب پرست کہ لوگ اسے
پاگل کہتے تھے اور اُس نے ریشمی رد مال میں بھول کاڑھنے کی بجائے
ست سری اکال کاڑھا تھا۔

میرے سامنے رنجیر سنگھ کا یہ انکشاف آ گیا کہ بشیرے اور زخمی ہندو
میں کسی لڑکی پر لڑائی جھگڑا نہ ہوا تھا۔ اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ لڑکی کون
ہے۔ میں اب سوچ میں پڑ گیا کہ یہ لڑکی کیا اجیت کو رہو سکتی ہے؟ اور
کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اجیت کو رہنے اپنے گھر سے رقم چور کر بشیرے
کے بھائی کو دی ہو کہ اچھا وکیل کرو اور بشیرے کی ضمانت کراؤ؟
نہیں۔ یہ ممکن نہیں تھا۔ اجیت کو راتنی چالاک نہیں تھی۔ مذہب میں ڈوبی
ہوتی یہ لڑکی ایک مسلمان کے ساتھ پاک یا ناپاک تعلق نہیں رکھ سکتی تھی۔
چوری کا ملزم سنت سنگھ تھا یا بشیرے کا بھائی۔ لہٰذا میں نے سوچ سوچ
کر یہ فیصلہ کیا کہ بشیرے کو بھی تھانے بلایا جاتے۔ اس کے بھائی کو تھانے
لانے کے لئے ایک کانٹیل چلا گیا تھا۔ میں نے ایک اور کانٹیل کو بشیرے

دلائی جاتے۔

اجیت کو رہنے رد مال پہچان لیا

صوبیدار اُس کی بیوی اور اجیت کو رہ گئے۔ صوبیدار کا بڑا بیٹا سنت سنگھ
بھی سامنے تھا۔ اُسے سامنے ہونا چاہیے تھا۔ اُس کے باپ، اُس کی ماں اور
اُس کی بہن کو تھانے بلایا گیا تھا۔ یہ معمولی بات نہیں تھی۔ میں نے
سنت سنگھ کو باہر بیٹھنے کو کہا۔ اُسے میں ابھی تک مشتبہ سمجھتا تھا۔ اُس
کی ماں اور بہن کو رد مال دکھایا تو ماں نے بے تابی سے کہا — ”یہ ہمارا
رد مال ہے۔ رقم اسی میں تھی“
”ماں بیٹی ایک بار چہرہ دیکھ لو“ — میں نے کہا — ”اچھی طرح دیکھ
کر بتاؤ۔“

اجیت کو رہنے رد مال کو پھیل کر دیکھا اور نبولی — ”یہ ہمارا ہی
رد مال ہے۔ سنت سری اکال میرے ہاتھ کا کاڑھا ہوا ہے۔ مجھے غلطی
نہیں لگ سکتی۔“

غلطی واقعی نہیں لگ سکتی تھی۔ رد مال کی حالت بتا رہی تھی کہ اس
میں کوئی چیز بندھی رہی ہے۔ کناروں پر گانٹھوں کی سلوٹیں ابھی موجود
تھیں۔ یہ دیکھنے کے لئے کسی تجربہ کار سراغ رساں کی ضرورت نہیں تھی۔
دس دس اور پانچ پانچ روپے کے نوٹوں کی گٹھی جس رد مال میں کئی مہینے
بندھی رہے، اسے آپ کھولیں تو کوئی بھی اسے دیکھے تو کہے گا کہ اس

کو ساتھ لائے کے لئے بھیج دیا۔

اجیت کو ر اور بشیرے کا تعلق کیا ہے؟

بشیرے کا بھائی پہلے آگیا۔ میں نے اُسے اپنے دفتر میں بٹھالیا۔ وہ بہت ہی گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے اُس کی گھبراہٹ دور کرنے کی کوشش نہ کی، بلکہ گھبراہٹ میں اضافہ کر دیا۔ میں اُس کے اعصاب توڑ کر اس کے ساتھ بات کرنا چاہتا تھا۔

”یہ رومال تمہارے پاس تھا“۔ میں نے رومال اُس کے آگے پھیلا کر رکھتے ہوتے کہا۔ ”یہ تم نے کہاں سے لیا ہے؟“

”یہ میرا اپنا ہے“۔ اُس نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔ زبان اُس کے قابو میں نہیں تھی۔

”تم سیکھ ہو یا مسلمان؟“

”مسلمان ہوں“۔ اُس نے جواب دیا۔

”لیکن اس رومال پر ست سری اکال کاڑھا ہوا ہے“۔ میں نے کہا۔ ”یہ تمہاری بیوی نے کاڑھا تھا؟ ماں نے یا بہن نے؟“

اُس کا سانس لارنگ لاش کی طرح ہو گیا اور وہ مجھے پٹٹی پٹٹی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔ میں نے اُس کے کندھے پر بڑی زور سے ہاتھ رکھا۔ وہ بُری طرح بدکا۔ شاید یہی میرا لڑم تھا۔

”میں کوئی سوال جواب نہیں کروں گا“۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ”یہ رومال تمہارا نہیں۔ تم نے چھوٹے مختانیدار کو پانچ سو روپیہ دیا اور اُس نے تم سے یہ رومال بھی لے لیا۔ اس رومال میں ڈیڑھ ہزار روپیہ اور بندھا ہوا تھا... باقی رقم کہاں ہے؟“

اُس کا منہ کھل گیا۔ آنکھیں مٹھ گئیں اور زبان ساتھ چھوڑ گئی۔ وہ جس صورت حال میں پھنس گیا تھا، اس میں انسان کا ردِ عمل یہی ہوتا ہے۔ دماغ توقف اور جسم کی طاقت سلب ہو جاتی ہے۔

اُس کی مونچھیں لمبی اور گھنی تھیں۔ میں نے اُس کی ایک مونچھ پکڑ کر کھینچی اور کہا۔ ”فوراُ لو لو ورنہ مونچھوں کے ساتھ رستی باندھ کر چھت کے ساتھ لٹکا دوں گا۔ تم دیکھ رہے ہو کہ جن کی رقم چوری ہوتی ہے اور جن کا یہ رومال ہے وہ باہر بیٹھے ہوتے ہیں۔ میں نے تمہیں خواہ مخواہ نہیں بلالیا۔“

اُس کی پٹٹی پٹٹی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اب مجھے زیادہ محنت یا مار کٹائی کی ضرورت نہیں تھی۔ اب ضرورت یہ تھی کہ اُسے ڈوبنے سے بچا لوں۔ یہ ایک خاص طریقہ ہوتا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ میں نے اُس کو متحکم کر سہارا دیا اور وہ پھٹ پڑا۔

”مجھے یہ رقم صوبیدار دربار سنگھ کی بیٹی اجیت کو ر نے دی تھی“۔ اُس نے کہا۔ ”کہتی تھی کہ یہ مقدمے پر خرچ کرو اور بشیرے کو چھڑاؤ۔ مجھے اور کچھ بھی معلوم نہیں۔ مجھے بالکل معلوم نہیں کہ بشیرے

ادراجیت کور کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ میں نے جھوٹے تھانیدار سے کہا کہ منہانت کرانے کے وہ کتنے روپے لے گا۔ اُس نے پانچ سو روپے مانگے، میں نے پانچ سو دے دیتے۔ اُس نے مجھے ایک وکیل کرا دیا۔ پانچ سو روپیہ اُس نے لے لیا اور اُس نے کہا کہ وہ اس رقم میں سارا کیس لڑے گا۔ باقی پانچ سو میرے گھر میں ہیں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ بشیرے کی ہندوؤں کے ساتھ لڑائی کیوں ہوتی تھی۔“

واگمور کی پیاری

میں نے اُسے وہاں سے ہٹا کر اجیت کور کو اندر بلا لیا۔ اُس کے چہرے پر ذرا انہی بھی گھبراہٹ نہیں تھی، بلکہ اُس کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا جس سے وہ اور زیادہ حسین اور پاک لگتی تھی۔
 ”اجیت کور!“ میں نے شفقت کے لہجے میں کہا۔ ”میں یہ نہیں کہوں گا کہ تم نے چوری کی ہے۔ یہ تمہاری اپنی رقم تھی۔ تم جسے چاہے دے دو۔ تمہارے ماں باپ کو معلوم نہیں تھا ورنہ وہ اسے چوری نہ کہتے۔ یہ آدمی جو ابھی یہاں سے باہر گیا ہے کہتا ہے کہ تم نے اسے اس رومال میں بندھی ہوئی رقم دی تھی اور کہا تھا کہ یہ بشیرے کے مقدمے پر خرچ کرو۔ کیا یہ آدمی سچ کہہ رہا ہے؟“
 وہ خاموش رہی لیکن اُس کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہ آئی، بلکہ

اُس کے ہونٹوں پر تبسم تھا وہ اور زیادہ کھل گیا۔
 ”کہہ دو، یہ آدمی جھوٹ بول رہا ہے۔“ میں نے کہا۔
 ”واگمور کی پیاری جھوٹ نہیں بولے گی تھانیدار!“ اُس نے تبسم کو قائم رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں سوچتی تھی کہ بات چھی رہی تو چپ رہوں گی، بات کھل گئی تو جھوٹ نہیں بولوں گی۔“ اُس نے گورکھی کا ایک شبہ سنا دیا اور اس کا ترجمہ کیا۔ ”جھوٹ بولنے والے کو جھوٹ بیٹھا لگتا ہے لیکن یہ ہوتا زہر ہے اور سچ زہر جیسا کڑوا ہوتا ہے لیکن ہوتا تریاق ہے۔“

وہ واقعی بنا رمل لڑکی تھی لیکن باہیں عقل کی کرتی تھی۔
 ”بشیرے کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”وہی جو سگے بھائیوں کے ساتھ میرا تعلق ہے۔“ اُس نے جواب دیا۔ ”جو آدمی کسی عورت کی عزت بچاتا ہے، وہ اُس کا بھائی نہیں ہوتا تو اور کیا ہوتا ہے۔“
 ”مجھے پوری بات سناؤ گی؟“ میں نے کہا۔
 ”کیوں نہیں سناؤں گی، لیکن تھانیدار! امیری بات پر تم اعتبار نہیں کرو گے۔“

”خود اعتبار کروں گا اجیت کور!“ میں نے کہا۔ ”پھر تم جو کچھ مجھے کہو گی، میں وہی کارروائی کروں گا۔“
 اُس نے جو کہانی سنائی وہ میں ذرا اختصار سے آپ کو

سناتا ہوں۔ اُس کا باپ چونکہ فوجی تھا اس لئے اپنے بچوں پر بڑی سختی کرتا تھا۔ لڑکے تو باہر تنہا کھیل آتے تھے، اجیت کو گھر میں باپ کی گھرکیاں سہتی رہتی تھی۔ وہ ماں باپ کے ساتھ کئی چھ ماہوں میں رہی۔ دس بارہ سال کی عمر میں اُس نے ماں کے ساتھ گور دوار سے میں جانا شروع کیا۔ گرنختی اُس سے بہت پیار کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی شبہ گانے والوں کی آواز اُسے اچھی لگتی تھی۔ یہاں سے وہ مذہب کی طرف مائل ہوتی۔ وہ وقت بے وقت گور دوار سے میں چلی جاتی۔ چونکہ خوبصورت بچی تھی اس لئے گرنختی اور ”بھائی“ اس کے ساتھ پیار کرتے تھے۔

لڑکپن کے آغاز میں اُس نے شبہ یاد کرنے شروع کر دیئے اور لگنڈے لگی۔ ایک گرنختی نے اُسے ہارمونیم پر شبہ گانے سکھا دیئے۔ اُس کی آواز کھل گئی۔ زمینوں کی دیکھ بھال کے لئے معمولی پیرانے اپنے بیوی بچوں کو گاؤں بھیج دیا۔ لڑکے جوان ہو چکے تھے اور اجیت کو رکی جوانی کا آغاز تھا۔ اس عمر تک وہ دنیا کی دلچسپیوں سے کنارہ کش ہو کر مذہب کی ہی ہو چکی تھی۔ میری راستے یہ ہے کہ باپ نے بچپن میں اس کا من مار دیا تھا۔ وہ اب واہور و اور خدا میں پیار ڈھونڈتی تھی۔ اسی میں اُسے روحانی نسلکین ملتی تھی۔

اب جوانی کی عمر میں وہ گور دوار سے میں جاتی تھی نو گاؤں کے دوچار سکھ لوجوان اُسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

آواز سے کہتے تھے مگر اجیت کو کسی کی طرف توجہ نہیں دیتی تھی۔ وہ اُن کی نیت سمجھتی اور حیران ہوتی تھی کہ انسان حیوان کس طرح بن جاتا ہے۔ وہ ایسا فائدہ چاہتی تھی جو شراب نہ پیتا ہو اور جو مذہب کا پابند نہ ہو۔ ایسا کوئی سکھ نہیں تھا جو شراب نہ پیتا ہو۔ سکھوں کے ہاں جنسی غلاظت اتنی تھی کہ اجیت کو رکو اُن سے گھن آتی تھی۔ یہیں سے لوگوں نے اُسے پاگل کہنا شروع کر دیا۔

اُس کے بیان کے مطابق ایک رات خواب میں اُسے بابا نانک ملے اور اُسے گاؤں سے کچھ دور ایک سمت دکھا کر کہا کہ وہاں بڑا ایک درخت ہے۔ اس کے نیچے بیٹھ کر مجھے یاد کرو تو میں تمہیں کسی صبح ایک اشارہ دوں گا۔ اُس نے علی الصبح وہاں جانا شروع کر دیا۔ تین دن جاتی رہی۔ اس دوران ایک ہندو لوجوان وہاں جا کر اُس کے ارد گرد گھومتا رہا۔ یہ لوجوان راستے میں یعنی کھیتوں سے گزرتے بھی اُسے پریشان کرتا تھا۔

چوتھی صبح وہ بڑے درخت تلے بیٹھی عبادت میں مصروف تھی ہندو ذرا پر سے پر سے اس کے گرد گھوم رہا تھا۔ بشیر اُدھر سے گزرا۔ وہ بشیر کو نہیں جانتی تھی۔ اُس نے بشیر سے کو بلا کر پوچھا کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان۔ بشیر نے بتایا کہ وہ اُسی کے گاؤں کا مسلمان ہے۔ اجیت کو رنے اُسے بتایا کہ یہ ہندو اُسے ہر روز آکر پریشان کرتا ہے اور بڑی گندی باتیں کہتا ہے۔ بشیر نے اُسے کہا کہ تمہارے دو جوان بھائی ہیں تم

رُکا۔ اجیت کو رنے اُسے بتایا کہ وہ ہر صبح یہاں عبادت کے لئے آتی ہے۔
بشیرے نے اُسے کہا کہ بے خوف ہو کر آیا کرو۔ کل میں بھی آؤں گا۔

یہ بابا نانک کا اشارہ تھا

اگلی صبح بشیرا بڑے درخت تک چلا گیا۔ ہندو وہاں پہلے سے موجود
تھا۔ میں حیران تھا کہ ایک ہندو کو یہ حرمت کیسے ہوئی کہ وہ ایک سکھ
کے پیچھے پڑا رہا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ہندوؤں کے پاس پیسہ تھا، نمبر دار بھی
انہی کا تھا اور ذلیل دار بھی اور میرا اُسے۔ ایس۔ آتی رہیں گے بھی اُن
کا حتمی تھا۔ بشیرے کو دیکھ کر ہندو نوجوان اجیت کو رنے کے قریب چلا
گیا اور اُس نے بشیرے کو لٹکایا۔ بشیرے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سیدھا گیا
اور ہندو کے مُنہ پر گھونسہ مارا۔ ہندو کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا جو اُس نے
بشیرے کو مارا۔ اس کے بعد ہندو بشیرے کو ڈنڈے اور بشیرا اُسے
گھونسے مارتا رہا۔ آخر ڈنڈا بشیرے کے ہاتھ میں آگیا۔ اُس نے ہندو
کو ڈنڈے مارے۔ وہ ایک دو بار گرا اور آخر اُٹھ کر بھاگ گیا۔

بشیرے نے اجیت کو رنے کہا کہ وہ یہاں سے چلی جاتے ورنہ
بدنام ہو جائے گی۔ لوگ کہیں گے کہ دو آدمی اُس کے لئے لڑے ہیں
اور کسی ایک کے ساتھ اس کی دوستی ہوگی۔ اجیت کو حیران و پریشان
چلی گئی۔ بشیرا دوسری طرف سے گاؤں کی طرف چلا گیا۔ اجیت کو رنے

انہیں کیوں نہیں بتائیں؟ اجیت کو رنے کہا کہ میں نے اپنے بھائیوں کو
بتایا تو وہ اسے قتل کر دیں گے اور پھانسی چڑھ جائیں گے۔ مجھے اپنے
بھائیوں کے ساتھ اتنا پیار ہے کہ میں اپنا آپ ان پر قربان کر دینا چاہتی
ہوں۔ میں انہیں نہیں بتاؤں گی۔ تم اس سے لڑنا مت۔ اسے ڈرا دو
کہ مجھے پریشان نہ کیا کرے۔

میں اندازہ کر رہا تھا کہ اس لڑکی کی باتیں عام انسانوں سے مختلف
اور زندگی کی عام ڈگر سے ہٹی ہوئی تھیں۔ اگر وہ نارمل ہوتی تو صحیح
معنوں میں سکھ بن جاتی۔ پھر کوئی ہندو اسے یوں پریشان کرتا تو وہ مردوں
کی طرح اُس کی بری حالت کرتی۔ سکھوں کی عورتیں مردوں جیسا
حوصلہ رکھتی تھیں۔

بشیرے نے ہندو کو شرافت سے کہا کہ وہ اس لڑکی کو پریشان
نہ کیا کرے۔ گاؤں میں مسلمانوں کی پوزیشن بڑی کمزور تھی۔ وہ اقلیت
میں تھے اور معمولی معمولی کسان تھے۔ ہندو نے مسلمان کی لٹکار کا جواب
بڑے رعب سے دیا اور کہا کہ تم اس لڑکی کے باپ لگتے ہو؟ اُس نے
کچھ بے جا کلمے بھی کہے۔ بشیرا بھی نوجوان تھا۔ اُس کا خون جوش میں آ
گیا۔ اُس نے ہندو سے کہا کہ اب اسے چھڑ کر دیکھو۔ خدا کی قسم، مہتاری
کھوپڑی توڑ کر دکھا دوں گا۔

اجیت کو رنے چپ چاپ سُنتی رہی۔ ہندو نے جو بکواس کی تھی وہ اُس
نے مجھے سُنانی اور کہا کہ ہندو بڑے غصے میں چلا گیا۔ بشیرا کچھ دیر وہاں

اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ اس واقعہ کا ذکر نہ کیا۔ اُسے ڈر تھا کہ اُس کے بھائی اس ہندو کو قتل کر دیں گے اور پھانسی چڑھ جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی اُسے یہ ڈر بھی تھا کہ اُسے باپ مارے پیٹے گا۔ اجیت کو رنے لے مجھے بتایا کہ گھر والے شاید یہ سمجھتے تھے کہ وہ علی الصبح گور دوار سے میں جاتی ہے۔

دو پہر کو گاؤں میں شور اُٹھا کہ پولیس آتی ہے اور اس کے بعد اجیت کو رنے کی خبر سُنی کہ پولیس ایشیہ کے کو پکڑ کر لے گئی ہے کیونکہ اُس نے فلاں ہندو سا ہوکا رکھا۔ بیٹے کو لوٹ کر قتل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اجیت کو رکا خون کھولنے لگا۔ غصے سے وہ بے چین ہونے لگی۔ وہ کسی کو بتا نہیں سکتی تھی کہ ایشیہ نے کسی کو لوٹنے اور قتل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اُس نے اتنا ہی کیا کہ گاؤں کی دوسری عورتوں کی طرح ایشیہ کے گھر چلی گئی۔ اُسے پتہ چلا کہ یہ تو غریب لوگ ہیں۔ ایشیہ کی ماں کو اُس نے بن کر تے دیکھا۔ وہیں اُس نے ایشیہ کے بھائی کو دیکھا۔

اجیت کو ر کو یہ ڈر تھا کہ پولیس اُسے بھی تنہا لے جاتے گی لیکن اُسے کسی نے نہ بلایا۔ اُس نے ایشیہ کے بھائی کو دیکھ لیا تھا۔ اُسے دو تین بار ملی۔ اُس نے اجیت کو ر سے کہا کہ ہم غریب لوگ ہیں، وکیل کے لئے بھی پیسے نہیں، اس لئے ضمانت نہیں ہوتی۔ اجیت کو ر کو معلوم نہیں تھا کہ تنہا لے اور عدالتوں میں کیا ہوتا ہے۔ وہ یہی جانتی تھی کہ

ایشیہ نے اُس کی عزت کی خاطر اتنی بڑی قربانی دی ہے۔ ایشیہ کے بھائی سے اُسے پتہ چلا کہ خاصا پیسہ ہو تو تنہا نذرانہ کو رشوت دے کر ضمانت ہو سکتی ہے اور اچھا وکیل کیا جاسکتا ہے جو ایشیہ کو بری کر لے گا۔

اجیت کو ر ہر لمحہ پریشان رہنے لگی۔ اُس کا دماغ اپنے انداز سے سوچتا تھا۔ اُس نے مجھے یوں سنایا۔ ”رات بابا نانک خواب میں آتے اور کہنے لگے کہ جس نے تیرے لئے قربانی دی ہے، اُس کے لئے تو بھی قربانی دے، یہی میرا اشارہ ہے۔ میں صبح اُٹھی تو مجھے سب سے پہلے یہ ڈیڑھ ہزار روپیہ یاد آیا جو ماں نے ٹرنک میں رکھا ہوا تھا میں نے اسے بھی بابا نانک کا اشارہ سمجھا۔ مجھے خیال آیا کہ میرے باپ کے پاس اتنی زمین ہے، اتنا زیادہ سونے کا زیور ہے۔ ماہوار اتنی زیادہ پنشن ملتی ہے۔ ماں کہتی ہے کہ اُس نے ایک جگہ بہت سا روپیہ رکھا ہوا ہے، مگر اُس آدمی کے پاس ایک پیسہ نہیں جو وکیل کی عورت کی عزت پر قربان ہوتا اور سولی پر کھڑا ہو جاتا ہے۔ مجھے اشارہ ملا کہ ڈیڑھ ہزار روپیہ نکال اور غریب آدمی کو دے دے۔“

اُس نے موقع کی تلاش شروع کر دی اور وہ دن آیا کہ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ اپنی بڑی بہن کے گھر گئی۔ بہن کے ہاں سچ پیدا ہوا تھا۔ وہاں بہت سی عورتیں جمع تھیں اور وہ گابجا رہی تھیں۔ اُس نے دیکھا کہ اُس کی ماں ایک چار پائی پر بیٹھی تھی۔ وہ وہاں سے اُٹھ

گئی اور چابیاں وہیں بھول گئی۔ اجیت کو رنے چابیاں اٹھالیں اور ماں سے یہ کہہ کر کہ تم چابیاں گم کر دو گی، چابیاں اپنے پاس رکھ لیں۔ فوراً ہی اُسے خیال آیا کہ وہ ڈیڑھ ہزار روپیہ نکال سکتی ہے۔

وہاں عورتوں نے رونہ بننا بھی سیکھی۔ اجیت کو روہاں سے بھسک آتی۔ اپنے گھر کے تالے اٹھانے سے کھولے۔ ٹرنک نکالتا کہ کھولا۔ بڑے آرام سے رومال میں بندھی ہوئی رقم نکال کر نیپے میں اٹس لی۔ یہاں پھر اُس کے دماغ نے اپنے انداز سے سوچا کہ رقم غائب پا کر اُس کی ماں کہے گی کہ چابیاں اُس کے پاس تھیں اس لئے یہی چور ہے۔ اجیت کو چارہ کترنے والا لٹو کر اٹھا لاتی۔ اسے اس نے ٹرنک کے پیچھے والے ایک قبضے میں رکھا اور زور لگایا۔ قبضہ بہت پرانا اور رنگ خورہ تھا، اُٹھ کر گیا۔ اُس نے دوسرا قبضہ بھی اکھاڑ دیا۔ اس سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ ٹرنک کسی باہر کے آدمی نے توڑا ہے کیونکہ اس کے پاس چابی نہیں تھی۔ اُس نے یہ نہ سوچا کہ گھر سے اور ڈیڑھ لاکھ کے دروازوں کے تالے تو وہ کھول کر لگا چلی ہے۔ ”باہر کے آدمی“ کے پاس ان کی چابیاں کہاں سے آگئی تھیں؟

دروازوں کو تالے اور باہر کے دروازے کی زنجیر چڑھا کر وہ بشیر سے کہہ گئی اور اُس کے بھائی کو الگ کر کے رومال سمیت رقم اُسے دی اور اُسے کہا کہ یہ رقم کسی کو نہ دکھائے، کسی کے ساتھ ذکر نہ کرے اور اس سے اپنے بھائی کو بچھڑا لے۔

میٹھا جھوٹ اور کرٹ واپس

میں اس لڑکی کے بیان پر اس لئے حیران نہ ہوا کہ وہ نفسیاتی کیس تھی۔ وہ نارمل نہیں تھی۔ اس کے ساتھ سوال جواب محض بریکار تھے۔ میں نے اُسے یہ کہہ کر باہر بھیج دیا کہ اپنے ماں باپ کو یہ نہ بتاتے کہ اُس نے مجھے کیا بتایا ہے۔

بشیر کے کا بھائی باہر بیٹھا تھا۔ اُسے پھر اندر بلایا۔ اُس سے پوچھ گچھ کے دوران اسے۔ ایس۔ آتی رکھیں سنگھ اور اجیت کو رنے کے بیانوں کی تصدیق ہو گئی۔ اس غریب آدمی نے کچھ بھی نہ چھپایا۔ اُس نے بتایا کہ رکھیں سنگھ نے، منبر دار اور ذیلدار نے ان کے گھر آکر بشیر سے کوڑا اور اسے مارا پٹیا، عورتوں کی بے عزتی کی اور جب بشیر سے نے کہا کہ یہ ہندو صوبیدار دربار سنگھ کی بیٹی کو پریشان کرتا تھا تو رکھیں سنگھ نے اُسے اور پٹیا اور کہا کہ اُس نے کسی لڑکی کا نام لیا تو اسے جان سے مار دیا جاتے گا۔

اس دوران بشیر ابھی آگیا تھا۔ وہ ابھی تک غصے میں تھا۔ بڑا جوشیلا نوجوان تھا۔ میرے سامنے آتے ہی بولا۔ ”میری ایک بات سن لو جناب! میں نے پہلے بھی پولیس کی بہت مار کھائی ہے، اب بھی کھالوں گا۔ میں نہیں بتاؤں گا کہ میں ضمانت پر ہوں۔ میں سچا ہوں۔

میں نے اس لڑکی کی عزت بچاتی ہے جو ابھی یہاں سے نکل کر گئی ہے۔ اگر مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ گے تو خدا کی قسم، ہاتھ لگا تو تمہیں اور تمہارے چھوٹے بھائی اور کو قتل کر دوں گا۔ اُس نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ اگر پنج کی سزا سچا سنسی ہے تو پولیس کے ایک دو بھائی اور ساتھ لے کر مروں گا۔

بھدا اس لڑکے نے میری روح بھی غوش کر دی۔ مجھے اس کے سچ کا علم ہو چکا تھا۔ میں نے اسے بٹھالیا اور تلی دی۔ اُس نے اجیت کو رکھ کر بیان کی تصدیق کر دی۔ اُس نے بھی بتایا کہ رگبیر سنگھ، ذیلدار اور نمبردار نے اُسے کس طرح مارا پیٹا تھا۔ بشیر اجیت کو رکھ کر نام لیتا تھا تو رگبیر سنگھ اُسے کہتا تھا کہ لڑکی کا نام نہ لو ورنہ مارے جاؤ گے۔ اُس کے خلاف قاتلانہ حملے اور ٹوٹنے کا کیس بنایا گیا اور وہ ہندو اس کے خلاف بیان لکھوا گئے جنہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ ہوا کیا ہے۔

میں نے اُسے تلی دی کہ میں اُسے بچاؤں گا اور اُسے ٹھنڈا کیا۔ اب میرے سامنے بڑا المبا پکڑ تھا۔ یہ میں مختصر کر کے سنا دیتا ہوں۔ رگبیر سنگھ سے میں نے پوچھا کہ اُس نے ہندو لڑکے کے ساتھ کار باپ سے کتنی رقم لی تھی۔ اُس نے مجھے خوش کرنے کے لئے بتا دیا کہ اُس نے ساتھ کار سے چھ سو روپے لئے تھے۔ اُس نے پھر مفت کی کہ میں اُس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کروں۔ اُس نے وہ پانچ سو روپیہ جو بشیر سے کے بھائی سے لیا تھا، میرے آگے رکھ دیا۔

میں نے اُسی وقت اُس کے خلاف رپورٹ لکھی جو بڑی سخت تھی۔ آخر میں لکھا کہ اسے لاتن حاضر کر کے اس کے خلاف کیس تیار کیا جائے۔ میویدار وغیرہ اور دیگر تمام افراد کو جنہیں بلایا تھا، گاؤں چلے جانے اور وہاں ہر

تھانے بلایا اور انہیں کہا کہ میں ان دونوں کے خلاف رپورٹ لکھ کر بھیج رہا ہوں اور ان کی ذیلداری اور نمبرداری ختم کر رہا ہوں۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر میرے قدموں میں بیٹھ گئے۔ اتنی بڑی چوٹ ان لوگوں کی برداشت سے باہر تھی، لیکن مجھے کوئی رپورٹ نہیں لکھنی تھی کیونکہ ان سے مجھے ایک کام لینا تھا۔

انہیں میں نے جی بھر کے ذلیل کیا، گالیاں دیں اور کہا کہ میں انہیں نہیں چھوڑوں گا۔ اس طرح ان کے پاؤں تلے سے زمین نکال کر میں انہیں وہاں لے آیا جہاں لانا چاہتا تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ اگر وہ اپنی ذیلداری اور نمبرداری کو بچانا چاہتے ہیں تو جس ہندو کے ساتھ بشیر سے کی لڑائی ہوئی تھی، اُس کے باپ سے جا کر کہو کہ اُس کا دوست رگبیر سنگھ لاتن حاضر ہو رہا ہے اور اب کیس میرے ہاتھ میں ہے۔ اب بشیر سے کی جگہ اُس کا بیٹا جیل میں جاسے گا۔

پھر ان دونوں سے میں نے کہا کہ تمام گواہوں سے کہہ دو کہ تم جھوٹی گواہی دینے آرہے ہو۔ ذرا سنبھل کر کورٹ میں آنا۔ میں سب کے خلاف جھوٹی گواہی دینے کے الزام میں مقدمہ پیش کر دوں گا۔

مختصر یہ کہ میں نے زبانی زبانی غیر قانونی حرکتیں کیں اور سب کو اتنا ڈرایا کہ ساہوکار تو اگلے روز میرے پاس آگیا اور ہندوؤں کے مخصوص طریقے کے مطابق ہاتھ جوڑ کر منہ تکی کر میں اس کے بیٹے کے خلاف کوئی کارروائی نہ کروں۔ میں نے اُسے اور زیادہ خوفزدہ کر دیا۔ اُس نے مجھے بھی کچھ رقم پیش کی جو میں نے قبول نہ کی۔ میں بشیر سے کو بچائے کی ترکیب کر رہا تھا۔ رگھیر سنگھ نے جو دوسرے جھوٹے گواہ بناتے تھے (اور جنہیں میں سچا سمجھتا رہا تھا) ذیلدار اور نمبردار نے اپنی حیثیت اور عزت بچانے کے لئے توڑ دینے۔

رگھیر سنگھ اتان حاضر ہو گیا۔ میں نے بشیر سے کے خلاف چالان عدالت میں پیش کر دیا۔ بشیر سے کے بھائی نے ایک بڑا قابل وکیل ستیہ پال کھنٹہ کیا تھا۔ پہلی پیشی پر میں اس سے ملا اور اسے ساری کہانی سنائی اور اسے بتایا کہ میں خود ہی یہ کیس تباہ کر رہا ہوں۔ وہ بڑا مالدار وکیل تھا۔ اُس نے بڑے اونچے کردار کا مظاہرہ کیا۔ اُس نے پانچ سو روپے بشیر سے کو واپس کر دیتے۔ اس تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ کیس کس طرح بشیر سے کے حق میں ہوا۔ مختصر یہ کہ بشیر ابری ہو گیا۔

ادھر صوبیدار کے گھر کی چوری کی ایف۔ آئی۔ آر اور دیگر کاغذی کارروائی کی نقلیں ہر طرف جا چکی تھیں۔ اس کیس کو بہر حال علاقہ مجھ ٹریٹ کے سامنے جانا تھا لیکن میں اجیت کور کو بچانا چاہتا تھا۔ ایک دو وکیلوں اور پی۔ ڈی۔ ایس۔ پی کی مدد سے صوبیدار دربار سنگھ نے اجیت کور کا

معاذہ ذہنی امراض کے ایک ڈاکٹر سے کرا کے کورٹ میں ثابت کر دیا کہ اس کا دماغی توازن صحیح نہیں۔ اس طرح اس کے خلاف کیس نہ چلا۔

ایک دلچسپ بات بھی سن لیجیے۔ رقم ڈیڑھ ہزار چوری ہوئی تھی۔ رگھیر سنگھ نے جو پانچ سو روپیہ بشیر سے کے بھائی سے لیا تھا، وہ اُس نے میرے حوالے کر دیا تھا۔ وکیل نے جو پانچ سو روپیہ لیا تھا، وہ اُس نے واپس کر دیا۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ پورا ہو گیا جو پہلے رومال میں باندھ کر صوبیدار دربار سنگھ کے حوالے کر دیا گیا۔

اے۔ ایس۔ آئی رگھیر سنگھ پہلے معطل رہا۔ اُس کے خلاف انکو اتاری ہوئی اور اُسے سروں سے برطرف کر دیا گیا۔

مجھے آج بھی اجیت کور کے الفاظ یاد آتے ہیں کہ بابا نانک نے خواب میں کہا تھا کہ جھوٹ میٹھا لگتا ہے لیکن ہوتا زہر ہے اور سچ کڑوا ہوتا ہے لیکن تریاق ہے۔ میری نظر میں اس لڑکی کا دماغی توازن ہم سب سے زیادہ صحیح تھا۔

